اشاعتی تفصیلات

جلد: 1 / شمارہ: 3

[جولائی، اگست، ستمبر] 2022ء/ 1444ھ

مدیر: ڈاکٹر نور محمد لکھنوی

معاون مدیر: میزان الرحمن علائی

مجلس ادارت

مجلس ادارت / ایڈیٹوریل ٹیم / مجلے کے حقوق

1- مجلہ–فکر فردا بغیر کسی عذر کے مقالے کو قبول کرنے سے منع کر سکتا ہے۔
2- مقالہ قبول ہونے کے بعد اس کی اشاعت کب کرنا ہے؟ یہ فیصلہ مجلس ادارت کی صواب دید پر ہوگا۔
3- مجلہ–فکر فردا اور اس کی مجلس ادارت کا مقالہ نگار حضرات کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں۔
4- مقالہ نگار حضرات اپنی آراء و تحقیقات سے متعلق حوالہ جات اور ضروری معلومات فراہم کرنے کے خود ذمہ دار ہوں گے۔
5- مقالہ نگار حضرات کی کسی بھی شرعی یا قانونی لغزش و خطا کے معاملے میں مجلہ–فکر فردا اور اس کی مجلس ادارت ذمہ دار نہیں ہوگی۔
6- اس مجلہ میں مطبوعہ کسی بھی تحریر کی اشاعت نو کے لیے مجلس ادارت سے پیشگی اجازت لینا ضروری ہے۔

اپنے علمی اور فکری مقالات و منظومات درج ذیل ای میل ایڈریس پر ارسال فرمائیں:

معاون مدیر: fikrefarda.content@gmail.com

مینیجر: manager.fikrefarda@gmail.com

Conceptualised, Owned & Electronically Published by Basharath Ali Siddiqui,
from Hyderabad, Telangana, India for Fikr-e-Farda Foundation, Hyderabad.
Address: Happy Homes Gardens; Flat # 310 & 311, Attapur Ring Road, Hyderguda, Upparpally PO,
Rajendranagar, Hyderabad, Telangana.
Contact Details: 00966501933690 / 00919121569542/ 00919502314649
Email Address: manager.fikrefarda@gmail.com

Designed By - AlQalamArts.com - Owais Siddiqui

ضیاے افکار

اداریہ

میزان الرحمن علائی
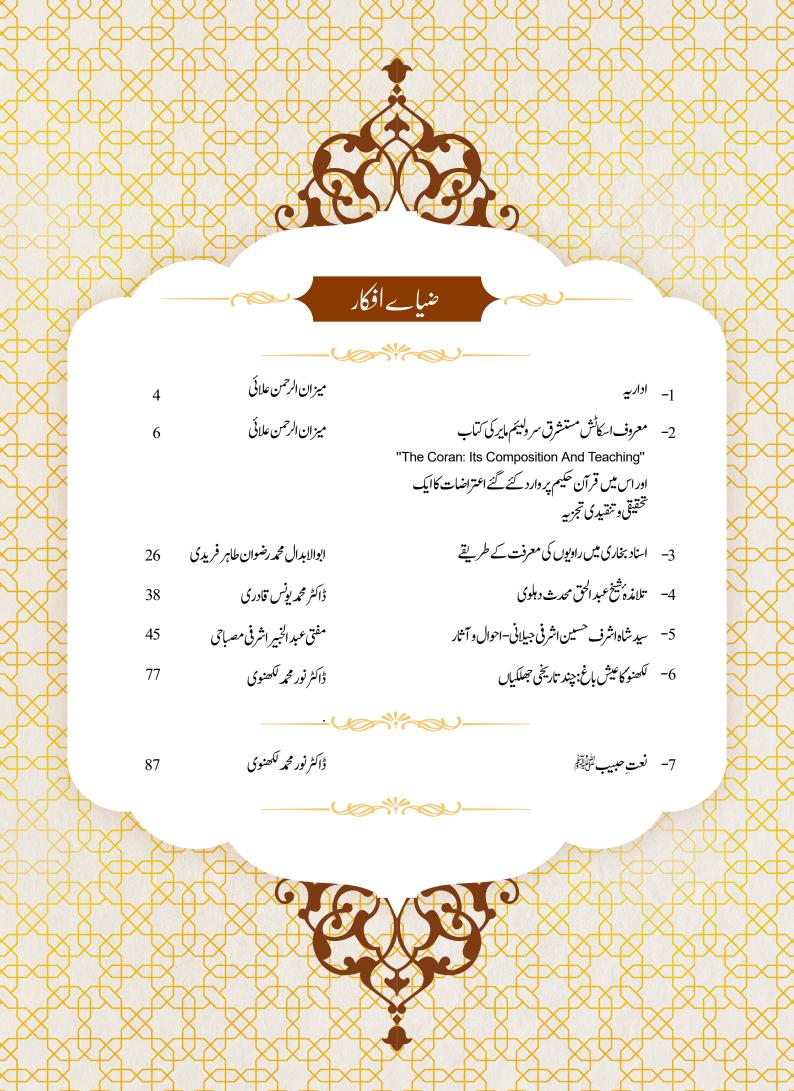
"ادب" اور "تحقیق" فکر و فن کے دو ایسے دھارے ہیں جو ہمیشہ متضاد سمتوں میں بہتے ہیں، کیوں کہ ادب کا دھارا جہاں تخیل، تصور، جذبات، رومانیت، شگفتہ نگاری اور رنگین بیانی کی پرسکون ندی میں کنول کی بھیگی زلفوں کو چوم کر الڑھ پن کے ساتھ آگے بڑھتا ہے وہیں تحقیق کا دھارا بے آب و گیاہ صحرا کی بیکراں وسعتوں میں اپنی مضطرب موجیں بہاکر صحرانوردوں کی پیاس مزید بڑھا دیتا ہے۔ ادب کے چمن میں جہاں سرد ہوائیں گلوں کے لب و رخسار کو سہلاتی ہوئی سدا محو خرام رہتی ہیں وہیں تحقیق کے چٹیل میدانوں میں شبنمی گیسوؤں کے خنک سایے کا تو ذکر ہی کیا! کبھی کسی مرغ خوش نوا کا گزر بھی نہیں ہوتا۔ بنابریں ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ شاعر و ادیب ہوتے ہیں وہ علی العموم محقق نہیں ہوتے اور جو لوگ تحقیق و جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں اُن کی تحریروں میں ادب کی چاشنی نہیں ہوتی۔ یہ کوئی قاعدہ کلیہ تو نہیں ہے تاہم عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے، اور اسی عمومیت کی بنا پر ہم نے اپنے موقف میں "علی العموم" کی قید لگائی ہے تاکہ مستثنیٰ حضرات اس عموم سے خارج ہوجائیں۔ ہم یہاں یہ دعویٰ تو نہیں کرتے کہ مجلہ "فکر فردا" اپنے بلندپایہ مقالات اور دلکش اسلوب کی بنا پر ادب اور تحقیق کا ایک انوکھا سنگم ہے یا یہ کہ اس نے اپنی ادبی اور فکری کاوشوں سے ایک منفرد دبستان فکر و شعور کو جنم دے دیا ہے تاہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ہماری پوری کوشش رہتی ہے کہ مجلہ "فکر فردا" اپنے قارئین کو جہاں تحقیق کے اونچے مناروں سے روشناس کرائے وہیں حسن نگارش کا آب کوثر عشاق ادب کی تشنہ لبی اور ذوق جمال کی تسکین کا ساماں بھی برابر مہیا کرتا رہے۔ اب ہم اپنی اس ادبی اور تحقیقی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہیں؟ یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

زیر نظر کاوش مجلہ "فکر فردا" کا تیسرا شمارہ ہے جس میں بنیادی طور پر فکر استشراق، راویان حدیث کی شناخت، اسلاف شناسی اور تاریخ و ثقافت جیسے اہم ترین موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔ پہلا مقالہ راقم سطور کا ہے جو مشہور مستشرق سر ولیم مایر کے اسلام مخالف نظریات اور اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور قرآن حکیم پر وارد کئے گئے اُن کے اعتراضات کا ایک تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پیش کرتا ہے۔

دوسرا مقالہ مولانا محمد رضوان طاہر فریدی کا ہے۔ اس مقالے کو آپ دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے حصے میں امام بخاری (۱۹۴-۲۵۶ھ) اور ان کی "صحیح" کے حوالے سے ایک وقیع گفتگو کی گئی ہے جب کہ دوسرا حصہ فہد بن علی الکشی کے ایک مختصر مگر بے حد مفید عربی رسالے "القواعد المفیدۃ" کا خوبصورت اردو ترجمہ ہے۔ دونوں ہی حصے شاندار ہیں تاہم ترجمے والا حصہ راقم سطور کے خیال میں علم حدیث کے شائق ہر شخص کو ضرور پڑھنا چاہئے۔

تیسرا مقالہ ڈاکٹر محمد یونس قادری کا ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۹۵۸-۱۰۵۲ھ) کے کچھ خاص تلامذہ کا تعارف پیش کیا ہے اور بنیادی طور پر یہ بتانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ حضرت محقق علی الاطلاق کا سلسلۂ حدیث عرب و عجم کی وسعتوں میں کن کن واسطوں اور طریقوں سے اشاعت پذیر ہوا ہے۔

چوتھا مقالہ حضرت علامہ مفتی عبدالخبیر اشرفی مصباحی کا ہے۔ اپنے مقالے میں مفتی صاحب قبلہ نے شیخ المشائخ علامہ سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی (۱۲۶۶-۱۳۵۵ھ) کے برادر کبیر حضرت علامہ سید شاہ اشرف حسین جیلانی کچھوچھوی (۱۲۶۰-۱۳۴۸ھ) کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ سید محترم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے مگر یہ وقت کی ستم ظریفی ہی کہئے کہ اتنی بڑی شخصیت پر عرصے سے بے توجہی اور بے التفاتی کی دھول جمی ہوئی تھی جسے مفتی صاحب قبلہ نے اپنے طور پر ہٹانے کی سعی بلیغ کی ہے۔

پانچواں مقالہ محب گرامی ڈاکٹر سید نور محمد لکھنوی کا ہے۔ اس مقالے کے تعلق سے بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ سید صاحب نے جہاں تنوع افکار، حسن نگارش، رنگ فصاحت اور وضع داری کے جلوے بکھیرے ہیں وہیں انہوں نے لکھنوی تاریخ و ثقافت کا ایک شفاف آئینہ بھی پیش کیا ہے۔
حاصل کلام یہ ہے کہ ہم نے اپنے طور پر حسن نگارش اور تحقیقی انتقاد کا ایک دل آویز گلدستہ آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ قدر کی نگاہیں ہماری ان علمی وفکری سوغاتوں کا استقبال کریں گی۔ والسلام۔

معروف اسکاٹش مستشرق سر ولیئم مایر کی کتاب
"The Coran: Its Composition And Teaching"
اوراس میں قرآن حکیم پر وارد کئے گئے اعتراضات کا ایک تحقیقی وتنقیدی تجزیہ

میزان الرحمٰن علائی
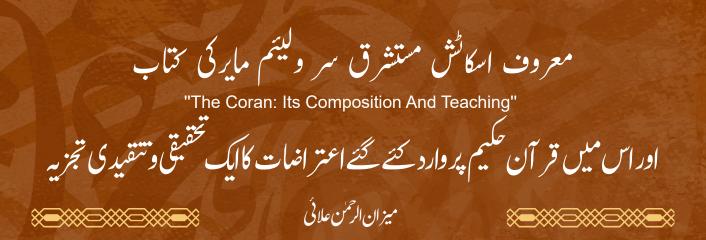
Abstract:

Sir William Muir was a Scottish Orientalist. He was born on 27th April,1819, in Glasgow, United Kingdom, and died on 11th July, 1905, in Edinburgh, United Kingdom. The following is what a Wikipedia article says about Muir's life and services:

"He was educated at Kilmarnock Academy, the universities of Glasgow and Edinburgh, and Haileybury Collage. In 1837 he entered the Bengal Civil Service. Muir served as secretary to the governor of the North-West Provinces, and as a member of the Agra revenue board, and during the Indian Mutiny he was in charge of the intelligence department there. In 1865 he was made foreign secretary to the Indian Government. In 1867 Muir was knighted (K.F.S.I), and in 1868 he became lieutenant-governor of the North Western Provinces."

Muir devoted himself primarily to research on Islamic sciences and arts, and wrote several books in this field. "Life of Mahomet and History of Islam to the Era of the Hegira", "Annals of the Early Caliphate", and "The Caliphate: Its rise, decline and fall", "An abridgment and continuation of the Annals", etc are some of his famous works. However, these books are not the subject of my discussion at the moment, but I would like to discuss Muir's other famous book "The Coran: Its Composition And Teaching; And The Testimony It Bears To The Holy Scriptures".

There is no doubt that Muir worked hard in compiling this book and stated things in a very academic manner, but this can be considered superficial in nature and approach; He has failed to hide his prejudice against Islam, its Holy book - The Quran and the Prophet of Islam. Due to his religious prejudice, he has written numerous things about the Qur'an which are not true in any way; Rather, it would be better to say that in the name of research, he has leveled accusations against the Holy Quran, the Prophet of Islam and Islam, which clearly shows the level of his negative approach and anti-Islamic sentiments. This article will try to expose these Islamophobic narratives, religious bigotry and answer some of questions raised on the Holy Quran.

Key Words:
Quran, Quranic Studies, Quranic Verses, Sequence of Quranic Chapters and Verses, William Muir, Orientalism.

ولیئم مایرؔ کی مشہور ترین کتاب "دی قرآن: اٹس کمپوزیشن اینڈ ٹیچنگ" اس وقت میرے سامنے ہے۔ کتاب ۲۳۹؍ صفحات پر مشتمل ہے اور بنیادی طور پر کلاسیکل انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے۔ "سوسائٹی فار پروموٹنگ کرسچین نالج، لندن" کی جانب سے یہ کتاب شائع کی گئی ہے۔ طباعت کی تفصیلات کے ساتھ کہیں تاریخ طباعت کا ذکر تو نہیں کیا گیا ہے تاہم مقدمہ کے نیچے ڈالی گئی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب غالبا ۱۸۷۸عیسوی میں شائع کی گئی تھی۔ موضوع کی بات کریں تو، جیساکہ کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے، یہ کتاب "قرآنیات" کے موضوع پر لکھی گئی ہے؛ اور غرض وغایت کے تحت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مایرؔ نے یہ کتاب انگریزی دنیا کو قرآنی مضامین سے آگاہ کرنے کے لئے لکھی ہے تاہم کتاب کا تحقیقی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان کا مقصد انگریزی دنیا کو قرآنی مضامین سے روشناس کرانے سے زیادہ یہ تھا کہ اسلام، پیغمبر اسلام اور قرآن حکیم کو انگریزی دنیا کی نگاہوں میں پوری طرح مجروح کر دیا جائے۔ مجھے یہ تو نہیں پتہ کہ اب سے پہلے کسی نے مایرؔ کے رقم کردہ ان مندرجات کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے یا نہیں؟ البتہ یہ ضرور پتہ ہے کہ مایرؔ بڑی حد تک اپنے مقاصد میں کامیاب رہے ہیں، کیوں کہ میں نے بہت سے اردو قلم کاروں کی جانب سے مایرؔ کو "ماہر علوم اسلامی" وغیرہ کا خطاب دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اسلام، پیغمبر اسلام اور قرآن کو عربی اور اردو زبانوں کے ذریعے سمجھنے والے بھی کسی نہ کسی حد تک مایرؔ سے ضرور متاثر ہیں؛ اور جب عربی و اردو داں طبقوں کا یہ حال ہے تب تو اسلام کو فقط انگریزی زبان، خصوصیت کے ساتھ، مایرؔ کی کتابوں سے سمجھنے والے یقینا اسلامی علوم وفنون کے حوالے سے مایرؔ کو ایک اتھارٹی اور سند قرار دینے میں لمحہ بھر بھی تامل نہیں کریں گے۔ ان ہی احساسات کے تحت میں نے یہاں مایرؔ کی کتاب "دی قرآن: اٹس کمپوزیشن اینڈ ٹیچنگ" کا ایک تنقیدی جائزہ پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ مایرؔ نے چوں کہ اپنی اس کتاب کو دو حصوں میں ترتیب دیا ہے جن میں سے ہر حصہ تین تین بابوں پر مشمل ہے، اس لئے میں یہاں کوشش کروں گا کہ "مطالعہ قرآن" سے متعلق ہر حصے کے قابل اعتراض مندرجات پر ترتیب وار ایک تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پیش کر دیا جائے۔

پہلے حصے کے پہلے باب میں ولیئم مایرؔ نے بنیادی طور پر حضور سید عالم ﷺ کی حیات مبارکہ پر روشنی ڈالی ہے اور انہوں نے اس باب کا عنوان ان لفظوں میں قائم کیا ہے: "The Coran as explained by the life of Mahomet"۔ اس باب کے چند ناگفتہ بہ اور ناقابل قبول مندرجات یہ ہیں:

مضامین کے الجھاؤ اور تعذر فہم کا الزام:

مایرؔ نے حصہ اول کے پہلے باب میں قرآن حکیم کے مضامین پر الجھاؤ، بے ترتیبی اور تعذز فہم کا الزام عائد کرتے ہوئے لکھا ہے:

"The Coran, taken by itself, is perhaps of all books the least intelligible. Of the Bible, although the circumstances under which various parts were composed, and even the names or eras of the writers are sometimes obscure, yet the substance is so arranged as seldom to leave the meaning, whether of the narrative or didactic portions, doubtful. With the Quran, on the contrary, although the main outlines of the author's life are well known, the whole is confused, and the drift often hard of comprehension.The books and chapters follow one another without any chronological sequence, and the books themselves are frequently composed of fragments put together with no regard either 'to time or subject.'' [1]

ترجمہ:

قرآن اپنی ذات کے اعتبار سے شاید تمام کتابوں میں سب سے کم سمجھ میں آنے والی کتاب ہے۔ اگر بائبل کی بات کریں تو جن حالات میں بائبل کے مختلف حصوں کی تشکیل عمل میں آئی ہے اُن کے تحت بعض اوقات نام اور زمانے بھی مبہم ہوتے ہیں تاہم مواد کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ شاذ ونادر ہی کوئی معنی چھوٹ جائے، چہ جائے کہ تذکراتی یا ناصحانہ حصے مشکوک ہوں۔ اس کے برعکس قرآن کا معاملہ یہ ہے کہ یہاں اگرچہ مصنف کی زندگی کے مرکزی خطوط سب کو معلوم ہیں مگر یہ سارا کا سارا آپس میں الجھا ہوا ہے اور اغراض کو سمجھنا اکثر بہت مشکل ہوتا ہے۔ پارے اور سورتیں کسی

تاریخی ترتیب کے بغیر ایک دوسری کے پیچھے چلتی چلی جاتی ہیں؛ اور خود سورتیں وقت یا موضوع سے قطع نظر اکثر ٹکڑوں پر مشتمل ہوتی ہیں

تجزیہ:

مایرؔ نے مذکورہ بالا پیراگراف میں قرآن حکیم کے مضامین پر بنیادی طور پر تین الزامات عائد کئے ہیں:

پہلا: یہ کہ قرآنی مضامین کنفیوژڈ یعنی باہم دگر الجھے ہوئے ہیں اس لئے ان کا سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔

دوسرا: یہ کہ سورتیں کسی تاریخی ترتیب کے بغیر ایک دوسری کے پیچھے چلتی جاتی ہیں۔ اور،

تیسرا: یہ کہ سورتیں اکثر وقت یا موضوع سے قطع نظر ٹکڑوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔

اب ہم ذیل میں علی الترتیب مایر کے عائد کردہ ان تینوں الزامات کا ایک تحقیقی اور منصفانہ تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

ا۔ متذکرہ بالا پیراگراف میں قرآنی مضامین پر مایرؔ کا پہلا الزام یہ ہے کہ: قرآنی مضامین کنفیوژڈ یعنی باہم دگر الجھے ہوئے ہیں اس لئے ان کا سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مایرؔ کا مطالعہ قرآن نہیں بلکہ اُن کا تعصب بول رہا ہے، ورنہ قرآن تو اپنے مضامین اور مفاہیم پر اتنی وضاحت کے ساتھ دلالت کرتا ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ واضح مفہوم والی کتاب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ خود اللہ پاک نے سورۃ: الروم میں فرمایا:

{وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ} [2]

یعنی: اور بے شک ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر قسم کی مثال بیان کردی۔

سورۃ: القمر میں اللہ پاک نے فرمایا: {وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ} [3]

یعنی: اور بے شک ہم نے قرآن کو نصیحت پکڑنے کے لئے آسان بنادیا ہے، تو ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا؟

سورۃ: یونس میں اللہ پاک نے فرمایا: { كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ} [4]

یعنی: ہم غور وفکر کرنے والوں کے لئے آیتیں یوں ہی مفصل طریقے پر بیان کرتے ہیں۔

سورۃ: ص میں اللہ پاک نے فرمایا: { كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ} [5]

یعنی: (اے نبی!) یہ کتاب جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی، برکت والی ہے؛ تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور ارباب عقل اس سے نصیحت پکڑیں۔

سورۃ: الدخان میں اللہ پاک نے فرمایا: {فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ} [6]

یعنی: تو ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان میں آسان کردیا ہے تاکہ وہ لوگ نصیحت پکڑیں۔

سورۃ: محمد میں اللہ پاک نے فرمایا: {اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا} [7]

یعنی: کیا یہ لوگ قرآن پر غور وفکر نہیں کرتے ؟ یا پھر بعض دلوں پر (کفر) کے تالے پڑے ہوئے ہیں؟

متذکرہ بالا آیتوں پر غور کریں تو یہ تمام آیتیں ہمیں واضح طور پر بتارہی ہیں کہ اللہ پاک نے ہمیں قرآن اسی لئے عطا کیا ہے کہ ہم اسے سمجھ کر پڑھیں اور پھر اس کی تعلیمات کو اپنی زمینی زندگی میں نافذ کریں۔ اب ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو قرآن اپنی تفہیم کی دعوت دے اور دوسری طرف اپنا مفہوم اس طریقے پر پیش کرے کہ وہ ہمیں سمجھ ہی میں نہ آئے؟ نہیں جناب والا! ایسا ہرگز بھی نہیں ہے، قرآن نے اگر اپنی تفہیم کی دعوت دی ہے تو بلاشبہ اس نے اپنا مضمون بھی اس طریقے پر پیش کیا ہے کہ وہ ہر صاحب ایمان کے دل پر نقش ہوجائے؛ جس کی کچھ توضیحات ماقبل میں گزرگئیں۔

اب رہی بات مایرؔ کے اس دعوے کی کہ "کہ قرآنی مضامین کنفیوژڈ یعنی باہم دگر الجھے ہوئے ہیں اس لئے ان کا سمجھنا بہت مشکل کام ہے" تو بتاتے چلیں کہ مایرؔ نے اس ضمن میں بس ایک دعویٰ ہی پیش کیا ہے، یعنی انہوں نے دعوی کے ساتھ بطور ثبوت قرآن حکیم کی کوئی بھی ایسی آیت پیش نہیں کی ہے جس کے بارے میں وہ کہہ سکیں کہ یہ آیت ناقابل فہم ہے۔ اگر مایرؔ اپنا دعوی معقول دلائل کے ساتھ مزین کرکے پیش کرتے تو ہم یہاں یقینی طور پر ان کی دلیلوں کا تجزیہ پیش کرنے کی بھی کوشش کرتے۔

لگے ہاتھوں بتاتے چلیں کہ ولیم مایرؔ کو مطالعہ کرتے وقت ہم نے خصوصیت کے ساتھ یہ بات نوٹ کی ہے کہ وہ اکثر مقامات پر محض خود ساختہ مجوزات اور مزعومات کی بنیاد پر بات کرتے ہیں، یعنی وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو مطعون کرنے کے لئے ایک نظریہ قائم کرتے ہیں اور پھر کسی

بھی دلیل کے بغیر محض اپنے خیالات اور تجویزات کی بنیاد پر الزامات کی ایک پوری عمارت کھڑی کر دیتے ہیں۔ بہت اونچی آواز میں تحقیق و تلاش کا دعوی کرنے والے مایرؔ کا یہ سطحی انداز آپ نے زیر نظر تبصرے میں بھی کچھ ملاحظہ کیا اور ان شاء اللہ تعالی آگے بھی کرتے رہیں گے۔

یہاں پر یہ سوالات بھی بجا طور پر قائم ہوتے ہیں کہ ولیئم مایر نے قرآن حکیم کا مطالعہ کر کے اپنی کتاب لکھی ہے یا پھر مطالعہ کے بغیر؟ اگر مطالعہ کیا، تو انہوں نے قرآن کو سمجھا، یا نہیں؟ اگر نہیں سمجھا، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں قرآنی مضامین کے ناقابل فہم ہونے کا الزام مایر کی اپنی کم عقلی اور کوتاہ فہمی کا اعلان ہے، خود مضامین قرآن کے قابل فہم ہونے پر اس سے کوئی حرف نہیں آتا؛ اور اگر سمجھا، تب تو مضامین قرآن کے کنفیوژڈ ہونے کی بات انتہائی حد تک لغو ہے؛ کیوں کہ جس چیز (یعنی مضامین قرآن) کو معترض سمجھ رہا ہے، اسی کو وہ ناقابل فہم باور کرانے کے بھی درپے ہے، فیاللعجب! اور اگر مایر نے امعان نظر کے ساتھ اور منصفانہ طور پر قرآن حکیم کا مطالعہ کئے بغیر اپنی کتاب لکھی ہے تب تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں قرآنی مضامین کے ناقابل فہم ہونے کا یہ الزام مایر کے مطالعہ قرآن پر نہیں بلکہ محض ان کی مذہبی عصبیت پر مبنی ہے، اور جو بات فقط مذہبی عصبیت پر مبنی ہو اُس کا بھلا کیسا اعتبار؟

۲۔ زیر نظر پیراگراف میں ولیئم مایرؔ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "سورتیں کسی تاریخی ترتیب کے بغیر ایک دوسری کے پیچھے چلتی جاتی ہیں۔" اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے اندر سورتوں کو من و عن تاریخ نزول کی ترتیب کے حساب سے پیش کرپانا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن ایک ساتھ نہیں بلکہ ۲۲ / یا ۲۳ / سال کی مدت میں ضرورت کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے، اور چوں کہ قرآن ضرورت کے مطابق نازل ہوا ہے اس لئے بہت سے مواقع پر ایسا بھی ہوا ہے کہ مثلا ایک ہی سورت کے کچھ حصے کبھی نازل ہو گئے اور پھر اس کے بعد دوسری سورتیں نازل ہوتی رہیں، پھر بعد میں جب کبھی ضرورت پیش آئی تو مقدم الذکر سورت کے بقیہ حصے نازل ہو گئے۔ چنانچہ امام جلال الدین سیوطی (۸۴۹-۹۱۱ھ / ۱۴۴۵-۱۵۰۵ء) نے اپنی معروف کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" کی "نوع اول" میں مکی و مدنی سورتوں کی معرفت کے تعلق سے ابوجعفر النحاس کی سند سے حضرت ابن عباس کا ایک قول نقل کیا ہے جس میں سورہ أنعام، أعراف، یونس، ہود، یوسف، رعد، ابراہیم، حجر، نحل، بنی اسرائیل، کہف، مریم، طہ، انبیاء، حج، مومنون، فرقان، شعراء، نمل، قصص، عنکبوت، روم، لقمان، سجدہ، سبا، فاطر، یٰس، صافات، ص، زمر، حوامیم سبعہ، ق، ذاریات، طور، نجم، قمر، رحمن، واقعہ، صف اور تغابن جیسی اور بھی کئی سورتوں کے بارے میں انہوں نے کہا ہے کہ ان سورتوں کا اکثر حصہ تو مکے میں نازل ہوا ہے تاہم اواخر کے کچھ حصے مدینے میں بھی نازل ہوئے ہیں۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد روایت کی سندی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے امام سیوطی نے لکھا ہے:

"هكذا أخرجه بطوله، وإسناده جيد، رجاله كلهم ثقات من علماء العربية المشهورين۔"[8]

یعنی: ابوجعفر نحاس نے یوں ہی طوالت کے ساتھ اس روایت کی تخریج کی ہے، اس کی اسناد جید ہے، اور سند میں موجود تمام رواۃ ثقہ اور عربی زبان کے مشہور علماء ہیں۔ اب آپ خود ہی بتائیں کہ جب یہ سورتیں ترتیب کے ساتھ نازل ہی نہیں ہوئیں تو پھر ان سورتوں میں تاریخ نزول کے اعتبار سے کیسے کوئی ترتیب قائم کی جاسکتی ہے؟ یوں ہی امام سیوطی نے سورہ فاتحہ، نساء، یونس، رعد، حج، فرقان، یسین، ص، محمد، حجرات، رحمن، حدید، صف، جمعہ، تغابن، ملک، دہر، مطففین، اعلی، فجر، بلد، لیل، قدر، لم یکن، زلزلہ، عادیات، الھاکم التکاثر، ماعون، کوثر، اخلاص اور معوذتین کے بارے میں حوالوں کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ یہ سورتیں مختلف فیہ ہیں یعنی ان میں سے کون سی سورت مکی ہے اور کون سی مدنی؟ اس بارے میں علمائے قرآن کے مابین کافی اختلافات واقع ہیں؛ اور ظاہر ہے کہ ان اختلافات کے ہوتے ہوئے آپ حتمی طور پر تاریخ نزول کے حساب سے ہر گز بھی کوئی ترتیب قائم نہیں کر سکتے۔

یہاں دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ جمہور علماء کے نزدیک سورتوں کی ترتیب صحابہ کرام کے اجتہاد سے قائم کی گئی ہے تاہم محققین علماء کی رائے یہ ہے کہ قرآنی آیتوں کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی اور تعلیمی ہے، یعنی صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیل کی معرفت اللہ عزوجل سے ترتیبِ سور کی تعلیم پائی تھی، تو گویا اس اعتبار سے سورتوں کی ترتیب وہی ہے جو ازل سے لوح محفوظ میں ثبت ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے امام ابوالقاسم کرمانی (م: ۵۰۵ھ / ۱۱۱۰ء) لکھتے ہیں:

"میں کہتا ہوں: قرآن کا آغاز سورہ فاتحہ ہے، پھر بقرہ، پھر آل عمران۔ یہی ترتیب سورۃ الناس تک ہے؛ اور یوں ہی اللہ کے پاس لوح محفوظ میں ثبت ہے، اور حضور ﷺ اسی ترتیب پر ہر سال حضرت جبرئیل کے روبرو قرآن کا دور کیا کرتے تھے، یعنی قرآن کا جتنا بھی حصہ حضور ﷺ کے پاس جمع ہو گیا ہوتا تھا؛ اور وفات کے سال حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل کے سامنے دوبار قرآن کا دور کیا۔ اور نزول کے اعتبار سے آخری آیت {وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ} تھی۔ حضرت جبرئیل نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ: اس آیت کو "آیت ربا" اور "آیت دین" کے مابین رکھیں۔"[9]

امام ابوبکر محمد بن قاسم انباری (۲۷۱-۳۲۸ھ) کہتے ہیں:

"حضرت جبرئیل رسول اللہ ﷺ کو سورتوں اور آیتوں کے مقامات بتادیا کرتے تھے، تو سورتوں کو پیش کرنا آیتوں اور حرفوں کو پیش کرنے ہی کی طرح ہے، تو یہ پوری (ترتیب) خاتم الانبیا حضرت محمد ﷺ کے واسطے سے رب العالمین کی جانب سے ہے۔ سو اگر کسی نے کسی مقدم سورت کو مؤخر کردیا، یا کوئی مؤخر سورت مقدم کردی تو گویا اس نے آیات کی نظم فاسد کردی اور حروف وکلمات بدل دیئے۔"[10]

ابن حصار کہتے ہیں:

"سورتوں کی ترتیب اور آیتوں کو ان کے مقامات پر رکھنا وحی کے ذریعے ہے۔"[11]

ابوجعفر النحاس کہتے ہیں:

"مختار یہی ہے کہ اس ترتیب پر سورتوں کی تالیف رسول اللہ ﷺ ہی سے ہے۔ حدیث میں ہے:

{أعطيت مكان التوراة السبع الطوال، وأعطيت مكان الانجيل المثاني، وفضلت بالمفصل} [أخرجه أحمد وغيره]۔

یعنی: توریت کی جگہ پر مجھے سبع طوال عطا کی گئیں، انجیل کی جگہ پر مجھے مثانی عطا کی گئیں، اور مفصل کے ذریعے مجھے فضیلت دی گئی۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن کی تالیف رسول اللہ ﷺ سے ماخوذ ہے، اور یہ ترتیب اِس وقت بھی اسی طرح قائم ہے۔"[12]

قتادہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں:

"مدینے میں قرآن کی یہ سورتیں نازل ہوئیں: البقرة، آل عمران، النساء، المائدة، الأنفال، البراءة، الرعد، النحل، الحج، النور، الأحزاب، محمد، الفتح، الحجرات، الرحمن، الحديد، المجادلة، الحشر، الممتحنة، الصف، الجمعة، المنافقون، التغابن، الطلاق، يأيها النبي لم تحرم الى رأس العشر، اذا زلزلت، اور: اذا جاء نصر الله۔ یہ سورتیں مدینے میں نازل ہوئیں، اور بقیہ قرآن مکے میں نازل ہوا۔"[13]

حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں:

"سورتوں کا بڑا حصہ توقیفی اور تعلیمی ہے، اس بات پر امام احمد اور ابوداؤد کی وہ روایت شاہد ہے جو انہوں نے اَوس ثقفی سے بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں:

"كنت في وفد ثقيف، فقال [لنا] رسول الله ﷺ: طرأ علي حزبي من القرآن، فأردت ألا أخرج حتى أقضيه. قال أوس: فسألنا أصحاب رسول الله ﷺ: كيف تحزبون القرآن؟ قالوا: نحزبه ثلاث سور، وخمس سور، وسبع سور، وتسع سور، واحدى عشرة سورة، وثلاث عشر سورة، وحزب المفصل، من {ق} حتى نختم."

یعنی: میں قبیلہ ثقیف کے ایک وفد میں تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا: وہ وقت دفعتًا آپہنچا جب میں قرآن پڑھا کرتا تھا، تو میں نے ارادہ کیا کہ اسے مکمل کرنے سے پہلے باہر نہ نکلوں۔ اوس کہتے ہیں: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے سوال کیا کہ: آپ لوگ کس طرح قرآن کے حصے کرتے ہیں؟ ان لوگوں نے جواب دیا: پہلی تین سورتوں کی ایک منزل، پھر پانچ سورتوں کی ایک منزل، پھر سات سورتوں کی ایک منزل، پھر نو سورتوں کی ایک منزل، پھر گیارہ سورتوں کی ایک منزل، پھر تیرہ سورتوں کی ایک منزل، اور پھر {ق} سے لے کر آخر تک مفصل سورتوں کی ایک منزل۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں: یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس وقت مصحف میں سورتوں کی ترتیب وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ہوا کرتی تھی۔"[14]

اتنی گفتگو کے بعد اب یہ عرض ہے کہ متذکرہ بالا اقتباسات کو مد نظر رکھ کر آپ ولیئم مایَر کے گزشتہ اعتراض کا جائزہ لیں تو آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ مایَر کا اعتراض محض عناد یا پھر ناسمجھی پر مبنی ہے۔ حافظ قتادہ بن دعامہ سدوسی (۶۱-۱۱۸ھ/۶۸۰-۷۳۶ء) کی روایت پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۲۷/ مدنی سورتوں کے نزول کی جو ترتیب بیان کی ہے وہ ترتیب بعینہ وہی ہے جو آج قرآن حکیم میں موجود ہے؛ لہٰذا ان مدنی سورتوں کی تاریخ نزول اور ترتیب سور میں مکمل طور پر یکسانیت کی وجہ سے اِن سورتوں کے تئیں مایَر کا اعتراض بدیہی طور پر بے بنیاد بن جاتا ہے۔ اور رہی بات مابقیہ سورتوں کی جن میں تاریخ نزول کے حساب سے سورتوں کی ترتیب قائم نہیں کی گئی ہے تو اس سلسلے میں ہم نے یہ بات واضح کردی ہے کہ محققین علمائے قرآن کے نزدیک آیتوں کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی اور تعلیمی ہے یعنی قرآنی سورتوں کی یہ ترتیب وہی ہے جو ازل سے لوح محفوظ میں ثبت ہے؛ بنابریں قرآن حکیم کی موجودہ ترتیب ہی "ترتیب حقیقی" ہے، اور اِس ترتیب کو اعتراض کا نشانہ بنانا دراصل اللہ رب العزت کی مشیت پر اعتراض کرنا ہے۔

۳۔ زیر نظر پیراگراف میں مایرؔ کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ:

"سورتیں اکثر وقت یا موضوع سے قطع نظر ٹکڑوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔" ہم نے یہ بات پہلے ہی بتادی تھی کہ ولیئم مایرؔ ثبوت اور دلیل پر نہیں بلکہ محض خیال اور مفروضے پر بات کرتے ہیں جس کا ایک روشن نمونہ آپ پیش نظر عبارت میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ مایرؔ نے بڑی آسانی کے ساتھ قرآنی آیات پر یہ الزام عائد کردیا کہ آیتیں زیادہ تر وقت اور موضوع سے مطابقت نہیں رکھتیں؛ جب کہ قرآن حکیم کی ادنی سمجھ رکھنے والا بھی یہ بات جانتا ہے کہ قرآن کی ہر آیت وقت اور ضرورت کے مطابق نازل ہوئی ہے، چنانچہ اس حوالے سے علمائے تفسیر نے "اسباب نزول" کو قرآن مجید کی تفسیر کا ایک بنیادی ماخذ قرار دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب قرآن مجید کی ہر آیت وقت اور ضرورت کے ساتھ مربوط ہوکر نازل ہوئی ہے تو پھر ایسی صورت میں قرآنی آیتوں کو "وقت" کے تقاضوں سے بے نیاز بتانا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی ظہر کے وقت یہ کہے کہ ابھی سورج نکلا ہی نہیں ہے۔

وقت سے آگے بڑھ کر اگر "موضوع" کی بات کریں تو مطالعہ قرآن کے تعلق سے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ اگرچہ قرآن حکیم کے اندر ان گنت علوم وفنون کی شریں نہریں بہہ رہی ہیں تاہم اساسی طور پر قرآن کا موضوع "نوع انسان کی ہدایت" ہے، اسی لئے سورۃ: البقرۃ کے آغاز ہی میں اللہ کریم نے اپنے کلام کی غرض وغایت اور موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: {هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ} یعنی: یہ کتاب بنیادی طور پر تقوی شعار افراد کے لئے سامان ہدایت ہے۔ اب آپ خود ہی غور کرکے بتائیں کہ قرآن حکیم کی وہ کون سی سورت ہے جس میں "ہدایت" کا پہلو نظر انداز کردیا گیا ہے؟ کیا آپ پورے قرآن میں ایک پوری سورت نہیں بلکہ محض ایک چھوٹی سی آیت بھی ایسی دکھاسکتے ہیں جس میں اولاد آدم کے لئے ہدایت اور رہنمائی کا ساماں موجود نہ ہو؟ اگر ہاں، تو کہاں؟ اور اگر نہیں، اور یقیناً نہیں؛ تو پھر قرآن کی اکثر سورتوں کو موضوع سے قطع نظر بتانے کا کیا مطلب نکلتا ہے؟ کیا یہ صورت حال واضح طور پر اس بات کی غماز نہیں ہے کہ متذکرہ بالا تمام اعتراضات اور الزامات صرف اور صرف اسلام کے تئیں ولیئم مایرؔ کے عناد اور تعصب کے نتائج ہیں؟؟

رسول اللہ ﷺ پر قرآن کی کچھ آیتیں بذات خود ترتیب دینے کا الزام؟

قرآن حکیم کے تعلق سے ولیئم مایر کا ایک نہایت ہی خوفناک الزام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی کچھ کی آیتیں بذات خود مرتب کی ہیں، چنانچہ اِس تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

"Some of the rhapsodical fragments embodied in the Coran were probably composed by Mahomet as his owe,before he conceived the notion of an absolutely objective revelation; But by the true believer the supposition would be rejected as impious. From beginning to end, in his eyes, every word of the Coran emanates direct from the Almighty".[15]

ترجمہ:

قرآن میں شامل کئے گئے کچھ بے ربط ٹکڑوں کو (حضرت) محمد (ﷺ) نے غالبا قطعی معروضی وحی کے تصور کو قبول کرنے سے پہلے بذات خود مرتب کر لیا تھا، مگر ایک سچے مومن کی طرف سے اس قیاس کو باطل قرار دے کر رد کردیا جائے گا۔ اس کی نظر میں شروع سے لے کر آخر تک قرآن کا ہر ایک لفظ بلاواسطہ اللہ وحدہ کی طرف سے صادر ہوتا ہے۔

تجزیہ:

اگر آپ مستشرقین کے احوال کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مستشرقین کی بڑی تعداد کسی نہ کسی جہت سے مشنری جماعت سے ضرور جڑی ہوئی ہے، اور ظاہر ہے کہ جس جماعت کے خمیر ہی میں اسلام مخالف جذبات موجود ہوں، آپ اُس جماعت کے نمائندوں سے ہرگز بھی یہ امید نہیں کرسکتے کہ وہ اپنی تحریر و تقریر میں اسلام، پیغمبر اسلام یا قرآن کے تئیں کوئی مثبت اور انصاف پسند رویے کا ثبوت فراہم کریں گے؛ چنانچہ مستشرقین کی بڑی تعداد نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ وہ کسی بھی طرح دنیا کو یہ باور کرائیں کہ قرآن؛ زبور، توریت اور انجیل وغیرہ کی طرح ہرگز بھی کوئی آسمانی صحیفہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک زمینی تخلیق ہے جسے حضور سید عالم ﷺ نے تصنیف کی ہے۔ قرآن حکیم پر ایسا سطحی الزام عائد کرتے وقت وہ ہمیشہ "تجاہل عارفانہ" کا ثبوت پیش کرتے ہیں، کیوں کہ خود قرآن حکیم نے ان کے اس الزام کا اس طرح رد کیا ہے کہ صبح قیامت تک وہ اپنے اس بیہودہ الزام کو کبھی ثابت نہیں کرپائیں گے۔

۱۔ اللہ پاک نے سورۃ: البقرۃ میں فرمایا:

{ وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۞ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ }[16]

یعنی: اور اگر تم کو اس (کتاب) میں کچھ شک ہے جو ہم نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر نازل کی ہے تو اس کی مثل ایک سورت تم بھی بنالاؤ اور اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بھی بلالو، اگر تم سچے ہو ☆ لیکن اگر (ایسا) نہ کر سکو، اور تم ایسا ہر گز بھی نہ کر سکو گے، تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے (اور جو آگ) کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

عربوں کو اپنی جس قومی ثروت پر سب سے زیادہ غرور تھا وہ ان کی زبان تھی، اور اپنی اسی لسانی ثروت کے تحفظ کی خاطر وہ اپنے جگر کے ٹکروں کو پیدائش کے فوری بعد ہی گاؤں دیہات میں بھیج دیا کرتے تھے تاکہ بہتر جسمانی نشو و نما کے ساتھ ان کی زبان خالص عربیت کی آئینہ دار ہو۔ اب آپ غور کریں کہ جو لوگ اپنی آبائی زبان کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے شہزادوں کا سنہرا بچپن مردہ پہاڑیوں کے دامن میں یا پھر چھوٹے چھوٹے صحرائی خیموں میں قربان کر دیا کرتے تھے، اُن لوگوں کو تب کیسا لگا ہو گا جب ان سے کہا گیا کہ اگر تم قرآن کو اللہ کا کلام تسلیم نہیں کرنا چاہتے تو ظاہر ہے کہ یہ کلام تو تمہاری ہی زبان میں ہے اور تم باکمال اہل زبان بھی ہو، اس لئے اس قرآن کی طرح فقط ایک ہی سورت لا کر دکھاؤ، اور ہاں! اگر تم یہ کام تنہا نہیں کر سکتے تو پوری دنیا کے جن و انسان کو بھی اپنی مدد کے لئے بلالو۔ سبحان اللہ! وہ لوگ جو کعبے کے دروازے پر اپنا کلام لٹکا کر خود کو ملک سخن کا تاجدار تسلیم کرتے تھے، جو عکاظ کے میلوں میں سنہرے خیمے لگا کر اپنے لسانی تفوق کا اظہار کیا کرتے تھے، جو اپنی لسانی وسعت اور فصاحت و بلاغت کی بنا پر تمام غیر عرب لوگوں کو عجمی یعنی گونگے کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے؛ یقیناً اس چیلنج نے ان کے لسانی غرور کی برہنہ پشت پر ایسا تازیانہ اہانت رسید کیا ہو گا جس سے ان کی روحیں تک مجروح ہو گئی ہوں گی؛ لیکن اس کے باوجود پورے عرب سماج کا قرآن کی مثل ایک چھوٹی سی بھی سورت لانے سے عاجز ہو جانا قطعی طور پر اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن رسول اللہ ﷺ کی ذاتی تصنیف یا کوئی زمینی تحریر نہیں بلکہ ایک آسمانی صحیفہ ہے، کیوں کہ اگر قرآن کوئی زمینی کارنامہ ہوتا تو صحرائے عرب کا بے حد ضدی اور اڑیل معاشرہ قرآنی چیلنج کے بعد یقینی طور پر قرآنی اسلوب میں نظم و نثر کا اتنا بڑا ذخیرہ پیش کر دیتا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

۲۔ قرآن حکیم نے پہاڑوں کی پائیداری اور استقلال کی اساس پر اپنے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہوئے کہا:

وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ[17]

یعنی: اور (کیا یہ لوگ غور سے نہیں دیکھتے) پہاڑوں کی طرف کہ وہ کس طرح نصب کئے گئے ہیں۔

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِهِمْ [18]

یعنی: اور ہم نے زمین میں بڑے بڑے پہاڑ بنائے تاکہ زمین کانپتی نہ رہے۔

وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا [19]

یعنی: اور (کیا ہم نے نہ بنادیں) پہاڑوں کو میخیں۔

یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ جدید سائنس کی معرفت آمدِ قرآن کے چودہ سو سال بعد ہمیں یہ پتہ چلا کہ زمین کی جس سطح پر ہماری زندگی آباد ہے، جس سطح پر ہم اپنے گھر مکان بناتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں اور کام کاج وغیرہ کر رہے ہوتے ہیں، وہ در اصل زمین کا ظاہری حصہ ہے۔ اِس ظاہری اور اوپری حصے کے نیچے ایک اور طبقہ ہے جو نسبتاً نرم اور ملائم ہے، اور زمین کے ظاہری و اوپری حصے پر موجود اونچے اونچے پہاڑوں کی بنیادیں اِسی نچلے طبقے کی زمین کے اندر پیوست ہوتی ہیں۔ نتیجے کے طور پر یہ پہاڑی میخیں زمین کو ڈانوا ڈول ہونے اور ہچکولے کھانے سے محفوظ رکھتی ہیں۔

سبحان اللہ! بیسویں صدی عیسوی کے سائنسی تجربات نے جو باتیں ہمیں آج بتائیں وہ تو ساتویں صدی عیسوی ہی میں یعنی تقریباً ساڑھے چودہ سو سال پہلے ہی واضح طور پر قرآن نے بتادی تھیں، جیسا کہ پیش کردہ گزشتہ آیتوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ تو اب سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کوئی انسانی کارنامہ ہوتا تو سائنسی علوم و فنون کی تدوین اور تجربات سے سینکڑوں سال قبل ہی ہمیں کس طرح قرآن کے اندر پہاڑوں کی ماہیت اور مفاد سے آگاہی حاصل ہو جاتی؟ یہ کیسے پتہ چل جاتا کہ یہ اونچے اونچے پہاڑ زمین کو ڈانوا ڈول ہونے اور نظام ہستی کو درہم برہم ہونے سے بچائے رکھنے کے لئے میخوں کی شکل میں زمین پر نصب کئے گئے ہیں؟ کیوں کہ زمینی حالات کی بات کریں تو یہ علمی باتیں تو ہمیں بیسویں صدی عیسوی کی تحقیق و تلاش کے نتیجے میں معلوم ہوئیں، پھر ان علوم و فنون کی تدوین سے سینکڑوں سال پہلے کس نے قرآن حکیم کے اندر اونچے اونچے پہاڑوں کی ماہیت اور یقینی مفاد سے ہمیں آگاہ کر دیا؟ کیا یہ

صورت حال واضح طور پر ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ یہ قرآن بلاشبہ اللہ کا کلام ہے اور اسی نے صدیوں پہلے قرآن حکیم کے اندر عظیم الشان پہاڑوں کی ماہیت اور مفادات سے نوع انسانی کو آگاہ کیا ہے؟ اور جب بات ایسی ہی ہے تو پھر پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ کو "مصنف قرآن" قرار دینے کی ضد کیا نری حماقت، حقائق سے چشم پوشی اور بے بنیاد نہیں ہے ؟؟

۳۔ اللہ پاک نے سورۃ: الانعام میں فرمایا:

﴿فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ﴾ [20]

یعنی: تو اللہ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے؛ اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے، اس کا سینہ خوب تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ زبردستی آسمان پر چڑھ رہا ہے۔

الف: آیت کریمہ میں ضیق اور حرج کے الفاظ قابل غور ہیں۔ مفردات امام راغب اصفہانی میں ہے کہ: الضِّيق والضَّيق کے معنی تنگی کے ہیں۔ علاوہ ازیں لفظ "حرج" کے بارے میں بھی مفردات ہی میں ہے کہ: الحَرَج والحَراج اصل معنی کے اعتبار سے اشیاء کے مجتمع یعنی جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں، اور جمع ہونے میں چوں کہ تنگی کا تصور موجود ہے اس لئے تنگی اور گناہ کو بھی حرج کہا جاتا ہے۔" خلاصہ کلام یہ کہ ضیق اور حرج دونوں لفظوں کے اندر بہرحال "تنگی" کا معنی موجود ہے۔

ب: "ص، ع، د" کے مادے سے جتنے بھی حروف متشکل ہوتے ہیں تقریباً سبھی کے اندر چڑھائی کا معنی متصور ہوتا ہے اور چوں کہ چڑھائی جیسی بھی ہو اُس میں تھوڑی بہت دقت تو پیش آتی ہی ہے، اِس لئے کبھی بطور استعارہ کسی دقت طلب اور دشوار گزار امر کو بھی "صَعَد" کہہ دیا جاتا ہے۔ خیر! یہ جملہ معترضہ کے طور پر تھا۔ کہنا یہ ہے کہ آیت کریمہ میں موجود "یصّعّد" میں مادہ کے حروف "ص، ع، د" ہیں، اور یہ اصل میں "یتصعّد" تھا، بعد تعلیل یصّعّد ہوا ہے جس کا معنی اوپر چڑھنے کے آتا ہے۔

اتنی فنی گفتگو کے بعد اب یہ عرض ہے کہ آیت کریمہ میں کہا گیا: اللہ جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔ یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ آخر آیت کریمہ میں سینے کی تنگی کے ساتھ آسمان کی چڑھائی اور بلندی کا ذکر کیوں کیا گیا؟ یہ کیوں کہا گیا کہ جیسے کوئی آسمان پر چڑھائی کے وقت سینے میں تنگی اور حرج محسوس کرتا ہے، ویسی ہی تنگی اور حرج اللہ اُس شخص کے سینے میں پیدا کر دیتا ہے جسے وہ گمراہ کرنا چاہتا ہے؟

آیئے! ذرا ٹھیک سے بات کو سمجھتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ تنفس کا نظام براہ راست پھیپھڑوں کے ساتھ مربوط ہوتا ہے اور پھیپھڑے سینے کے اندر دل کے قریب موجود ہوتے ہیں اور چوں کہ اوپر آکسیجن کی کمی ہوتی ہے اس لئے آپ جتنا اوپر چلتے جائیں گے، تنفس کا نظام اتنا زیادہ متاثر ہوتا جائے گا؛ اور پھر نتیجے میں آپ کے سینے کے اندر تنگی اور گھٹن بڑھتی جائے گی۔ چنانچہ اگر پیشگی طور پر آکسیجن کا مناسب انتظام نہ کر لیا جائے تو کافی کچھ برا بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہوائی جہازوں میں پرواز سے قبل ہی بطور خاص آکسیجن کی مناسب مقدار فراہم کر دی جاتی ہے۔ تو چوں کہ اوپر آسمان کی طرف جانے پر آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سینے کے اندر گھٹن اور تنگی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ گھٹن اور تنگی بڑھتی ہی جاتی ہے اسی لئے زیر نظر آیت کریمہ میں گمراہ شخص کے سینے کو آکسیجن کی کمی کے شکار شخص کے سینے کے ساتھ تشبیہ دی گئی، کہ جس طرح اوپر آکسیجن کے پرابلم کی بنیاد پر پھیپھڑوں میں مناسب مقدار میں ہوا نہ جانے کی وجہ سے سینے کے اندر گھٹن اور تنگی محسوس ہوتی ہے، ٹھیک اُسی طرح اللہ تعالی جس بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ نہیں فرماتا اُس کے سینے میں معنوی گھٹن اور تنگی بھر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ بد نصیب بندہ نور ایمان سے نفور اور خیر کثیر سے یکسر دور ہو جاتا ہے۔

اتنی توضیحات کے بعد اب مدعے کی بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ جس زمانے میں اور جس معاشرے میں نازل ہوئی تھی، اُس زمانے اور اُس معاشرے کے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اوپر آکسیجن کی کمی بھی ہو سکتی ہے، بلکہ الٹے ان کا خیال تو یہ تھا کہ جتنی زیادہ اونچائی پر جائیں گے اُتنی ہی زیادہ تازہ اور فرحت بخش ہوائیں دل و دماغ کو سرور عطا کریں گی۔ ایسے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے عرب کے سادہ کلچر لوگوں کو بتایا کہ اوپر آکسیجن کی فراوانی نہیں بلکہ آکسیجن کی نہایت درجہ کمی ہے؟ وہ کون ہے جس نے کئی ہزار فٹ بلندیوں کی اطلاعات ان تک بہم پہنچائیں؟ ظاہر ہے کہ وہ عرب معاشرے کا کوئی فرد تو ہرگز ہو نہیں سکتا، کیوں کہ انسان ان ہی جگہوں کی اطلاعات پہنچا سکتا ہے جہاں تک وہ خود رَسا بھی ہو اور ظاہر ہے کہ اُس زمانے کا کوئی انسان آج کی طرح ایروپلین میں بیٹھ کر ہواؤں کی سیر تو کر نہیں رہا تھا۔ تو پھر وہ کون ہے جس نے طیبہ کے کچے مکانوں

اور صحرا کے نخلستانوں میں رہنے والوں کو بتایا: **يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقاً حَرَجاً كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ** ؟وہ کون ہے جس نے چودہ صدیاں بعد زیر تجربہ آنے والی حقیقتیں چودہ صدیاں پہلے ہی آشکار کردیں؟ بیشک پورے قضیہ پر امعان نظر کے ساتھ غور و فکر کرنے اور عرب کلچر کو جانچنے پرکھنے کے بعد کہنا پڑے گا کہ یہ کلام ایک ایسی قدیم ہستی کا ہے جو قادر مطلق ہے اور جس کے دائرہ علم سے کوئی بھی شے خارج نہیں ہے، اور یقینی طور پر ایسی ذات فقط اللہ تعالی کی ہے۔ کیا اتنی روشن اور غیر مبہم دلیل کے بعد بھی آپ یہ کہیں گے کہ قرآن کوئی آسمانی صحیفہ نہیں بلکہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی ایک ذاتی تصنیف ہے؟؟

لفظ "Assumption" کا استعمال:

ولیئم مایر کی علمی خیانت کا ایک واضح تر نمونہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دعوے کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں لیکن اُس متعین اور روشن خاکے میں رنگ اپنی مرضی کے مطابق بھرتے ہیں۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے دعوی نبوت کو انگریزی دنیا کے سامنے محض ایک فرضی اور وہمی تصور قرار دینے کے لئے وہ "دعوی نبوت" کو ایک مخصوص انگریزی لفظ "Assumption" سے تعبیر کرتے ہیں، مثلاً صفحہ نمبر ۱۳ر میں وہ لکھتے ہیں:

"For some time before his assumption of the prophetic office, Mahomet had been sharing the burden of his soul with the intimate friends and relativess around him".

یعنی: اپنے منصب رسالت کو قیاس اور فرض کرنے سے کچھ وقت پہلے ہی سے حضرت محمد (ﷺ) آس پاس موجود اپنے قریبی دوستوں اور رشتے داروں سے اپنی روح کا بوجھ بانٹ رہے تھے۔۔۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ اس لفظ "Assumption" سے فرض کرنا، قیاس کرنا، قبضہ کرنا اور شیخی بگھاڑنا وغیرہ کے معانی متبادر ہوتے ہیں تو گویا مایرؔ ایسے نامناسب الفاظ کے استعمال سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کا دعوی یا منصب محض ایک فرضی اور وہمی واقعہ ہے۔

تجزیہ:

دیکھئے! ناسمجھی کے اعتبار سے منطق کی زبان میں لوگوں کی تین قسمیں ہیں: (۱) بشرط شئ، (۲) بشرط لاشئ، اور (۳) لابشرط شئ۔

بشرط شئ: میں وہ لوگ آتے ہیں جو فی الواقع شے کو سمجھتے تو نہیں ہیں لیکن وہ لگن اور جستجو کے ساتھ شے کو سمجھنا ضرور چاہتے ہیں۔

بشرط لاشئ: میں وہ لوگ آتے ہیں جو شے کو نہ سمجھنے کی ضد لئے بیٹھے ہوتے ہیں۔

لابشرط شئ: میں وہ لوگ آتے ہیں جو مثبت یا منفی کسی بھی خاص پہلو کی جانب کوئی جھکاؤ نہیں رکھتے، یعنی وہ نہ تو سمجھنے کی ضد لئے بیٹھے ہوتے ہیں اور نہ ہی نہ سمجھنے کی ضد لئے؛ بس اگر موقع بن گیا تو تفہیم شے کی کوشش کرلی، ورنہ کوئی بات نہیں۔

اب ان تینوں قسموں میں سب سے زیادہ ڈھیٹ اور ضدی دوسری قسم یعنی "بشرط لاشئ" والے لوگ ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص یہ تہیہ کرلے کہ اُسے سمجھنا ہی نہیں ہے تو پھر بھلا کوئی اُسے کیسے سمجھا سکتا ہے؟ مثلا: زید اگر یہ ٹھان لے کہ میں نے فلاں مسئلہ نہیں سمجھنا ہے تو یقین جانئے کہ رازی، غزالی، ابن عربی اور ابن سینا بھی اگر اپنی اپنی قبروں سے باہر آجائیں تو بھی زید کو سمجھا نہیں پائیں گے، کیوں کہ "فلاں مسئلہ" چاہے روشنی ہی کی طرح زید کے ذہن میں کیوں نہ واضح ہوجائے مگر اپنی ضد کی وجہ سے وہ تو یہی کہے گا کہ میں نے نہیں سمجھا؟ یقین جانئے کہ یہی حال مستشرقین کا ہے۔ یہ "بشرط لاشئ" والے لوگ ہیں، انہیں آپ کتنا بھی سمجھالیں مگر یہ اپنی ضد، تعصب اور عناد کی وجہ سے یہی کہیں گے کہ ہم نے نہیں سمجھا۔

متذکرہ بالا انگریزی پیراگراف میں رسول اللہ ﷺ کے منصب نبوت و رسالت کو محض ایک وہمی تصور قرار دیا گیا، اور اس جرم میں مایرؔ تنہا نہیں ہیں بلکہ مستشرقین کی بڑی تعداد نے نبوت صادقہ کی سب سے بڑی دلیل وحی اور معجزہ ہی کو وہم اور روحانی تجربہ قرار دیا ہے۔ قرون وسطی کے مستشرقین نے توصلیبی جنگوں کی شکست کا غبار نکالتے ہوئے حضور سید عالم ﷺ پر نزول وحی کے تعلق سے یہ الزام عائد کردیا تھا کہ نعوذ باللہ ایک تربیت یافتہ کبوتر آپ ﷺ کے کاندھے پر بیٹھا رہتا تھا، آپ اپنے کان میں دانہ رکھتے جسے چگنے کے لئے وہ کبوتر آپ کے کان میں چونچ مارتا؛ اور کبوتر کے چونچ مارنے کی آواز کو آپ وحی خیال کرلیتے تھے۔ مستشرقین نے اتنے بڑے پیمانے پر اس جھوٹ کی تشہیر کی کہ کئی نامور انگریزی ادیبوں نے اس جھوٹ کو اپنی تخلیقات میں ایک کردار کے طور پر پیش کیا۔ یہ الزام اتنا سطحی اور بیہودہ تھا کہ آگے چل کر خود مستشرقین کے ایک دھرے نے اسے ماننے سے انکار

کر دیا، چنانچہ مشہور اسکاٹش مؤرخ اور فلاسفر تھامس کارلائل (۱۷۹۵-۱۸۸۱ء) نے اپنی کتاب "آن ہیروز" میں کبوتر والے واقعے کے بارے میں لکھا ہے:

" The lies, which well-meaning zeal has heaped round this man, are disgraceful to ourselves only. When Pocock inquired to Grotius, where the proof was of that story of the pigeon, trained to pick peas from Mahomet's ear, and pass for an angle dictating to him? Grotius answered that there is no proof. It is really time to dismiss all that".[21]

ترجمہ:

وہ جھوٹ جس کی خیر سگال جذباتی شدت نے اس آدمی (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے وہ ہمارے لئے صرف رسوائی کا باعث ہے۔ پوکوک نے گروٹیس سے پوچھا کہ: کبوتر والی اُس کہانی کا ثبوت کہاں ہے جسے محمد (ﷺ) کے کان سے مٹر چننے اور ان کی طرف اشارہ کرنے والے ایک خاص زاویے سے گزرنے کی تربیت دی گئی تھی؟ گروٹیس نے جواب دیا: اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ سچ میں وقت آ گیا ہے کہ یہ ساری باتیں مسترد کر دی جائیں۔

کہنے کا منشایہ ہے کہ مستشرقین نے وحی اور معجزے کی حیثیت کو مجروح کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ پر اتنے گھٹیا قسم کے الزامات عائد کئے کہ جنہیں سوچ کر ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں نے اخلاق و کردار کے تقاضوں سے پرے ہو کر وحی اور معجزے کے تعلق سے ایسی لایعنی باتیں فقط اس لئے وضع کی ہیں کہ وحی اور معجزے کا اثبات دراصل رسول اللہ ﷺ کی نبوت صادقہ پر بین دلیل ہے، کیوں کہ کسی غیر نبی کے پاس نہ تو وحی آ سکتی ہے اور نہ ہی اس سے معجزات صادر ہو سکتے ہیں۔

یہاں مستشرقین نے وحی اور معجزے کا انکار تو کر دیا لیکن اس انکار کی بنا پر جو الزام اُن پر عائد ہوتا ہے اُسے وہ اب تک رفع نہ کر سکے، اور قیامت تک کبھی کر بھی نہیں سکیں گے۔ وحی کے تعلق سے قرآن کا یہ کھلا چیلنج تھا کہ اگر تم قرآن حکیم کو کلام الٰہی اور وحی تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہو تو تم سب مل کر قرآن کی مثل ایک سورت ہی لا کر دکھاؤ، چنانچہ اس تعلق سے سورۃ: البقرۃ کی دو آیتیں ماقبل میں پیش کی جا چکی ہیں۔ اسی مضمون پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے اللہ پاک نے سورۃ: طور میں فرمایا:

{أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ ۔ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ} [22]

کیا کفار یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی حضور ﷺ نے) قرآن از خود بنا لیا ہے؟ بلکہ یہ لوگ ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ اگر یہ لوگ سچے ہیں تو اس جیسی ایک بات تو بنا لائیں۔

یوں ہی سورۃ: ہود میں اللہ پاک نے فرمایا:

{ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۔ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ} [23]

یعنی: کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی حضور ﷺ نے) قرآن از خود بنا لیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو تم بھی ایسی دس سورتیں بنا لاؤ؛ اور اللہ کے سوا جس کو بھی بلا سکو، بلا لو۔ تو اگر وہ تمہاری بات کا جواب نہ دیں تو (اے اہل ایمان!) جان لو کہ (یہ کلام) اللہ ہی کے علم سے نازل ہوا ہے اور یہ کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو کیا اب تم تسلیم کرو گے؟

مستشرقین کے دعوے اور قرآن مجید کے زبردست چیلنج کو دوبارہ پڑھئے، اور بتائیے کہ کیا قرآن حکیم کے اس چیلنج کے بعد مستشرقین پر اصولاً یہ لازم نہیں تھا کہ وہ چوں کہ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کا انکار کرتے ہیں اس لئے وہ بھی قرآن جیسی کم از کم ایک ہی سورت بنا لائیں تاکہ قرآن حکیم کا مطالبہ پورا ہو؛ لیکن ظاہر ہے کہ وہ ایسا کبھی کر ہی نہیں سکتے، اور بھلا وہ ایسا کرنے پر کس طرح قادر ہو سکتے ہیں جب کہ قرآن حکیم کی بے مثال فصاحت وبلاغت کے آگے فصحائے عرب کی بھی زبانیں گونگی ہو گئی تھیں؟ مگر اس قدر بے بسی اور بے آبروئی کے باوجود وہ یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں کہ قرآن حکیم وحی الٰہی ہے۔ اسے محض ضد، ہٹ دھرمی اور مذہبی عناد کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

وحی سے آگے بڑھ کر اگر معجزے کی بات کریں تو ظاہر ہے کہ معجزے جید اسناد کے ساتھ بطریق تواتر منقول ہیں جن کی صداقت میں شبہ کی رتی بھر بھی گنجائش نہیں ہے مگر بایں ہمہ مستشرقین کا کہنا یہ ہے کہ یہ تمام روایتیں محض مسلم علماء ہی سے منقول ہیں۔ ارے بھائی! اگر ۶۰۰ ق م سے لے کر ۲۰۰ ق م کے دوران مرتب ہونے والے فلسفیانہ اصول و نظریات معلوم کرنے ہوں تو ہمیں موجودہ مغربی مفکرین کے سائنسی نظریات کی دہلیز

پر حاضری دینی چاہئے یا پھر قدیم یونانی فلسفیوں کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے؟ ظاہر ہے کہ مدعا جس عہد کا ہوگا اور جس سماج سے متعلق ہوگا، اس کی تحقیق بھی اسی عہد اور اُسی سماج کے باوثوق افراد سے کی جائے گی۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ تاج محل کی تعمیر میں استعمال کئے گئے پتھروں کی تحقیق آپ برطانیہ جاکر ملکہ وکٹوریہ کے محل میں کریں! بلاشبہ تاج محل کی تحقیق کے لئے آپ کو آگرہ ہی جانا پڑے گا۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ جب زیر بحث "معجزہ" پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ کا معاملہ ہے تو اس کی تحقیق و جستجو کے لئے آپ کو یقینی طور پر عہد نبوی اور ریاست مدینہ کے باوثوق افراد ہی کے یہاں جانا ہوگا، اور جب ہم عہد نبوی اور ریاست مدینہ کے باوثوق افراد کی جانب رجوع کرتے ہیں تو تمام معتبر ترین ذرائع اس بات پر قطعی طریقے سے گواہی دیتے ہیں کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ کی زندگی میں ان کی بابرکت ذات سے بہت سے معجزات صادر ہوئے؛ تو ایسی صورت میں معجزات کا انکار یا معجزات کے ثبوت میں عہد نبوی کے باوثوق افراد سے جید اسناد کے ساتھ بطریق تواتر چلی آرہی شہادتوں کو ناقابل قبول بتانا کیا انصاف اور دیانت کا خون نہیں ہے؟؟

اب جب کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ سے متعلق وحی اور معجزات کے ثبوت میں محکم دلیلیں پیش کی جاچکیں، اور ہم جانتے ہیں کہ وحی اور معجزات صرف اور صرف انبیائے کرام کی خاصیات ہیں، تو پھر پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ کی نبوت صادقہ کے حوالے سے شک کی کوئی بھی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ ایسی صورت میں ولیئم مایرؔ کا حضور ﷺ کی سیرت لکھتے وقت "منصب نبوت" کے لئے "Assumption" وغیرہ جیسے الفاظ لکھ کر ایک عام قاری کی نظر میں آپ ﷺ کے منصب نبوت کو مشکوک بنانے کی کوشش کرنا بلاشبہ ان کی بدترین علمی خیانت اور مذہبی عصبیت کا ایک واضح تر نمونہ ہے۔

کیا قرآنی واقعات یہودی روایات کے زیر اثر رسول اللہ نے خود مرتب کئے ہیں؟

گزشتہ تحریر میں آپ نے یہ ملاحظہ کیا کہ دیگر مستشرقین کی طرح ولیئم مایرؔ بھی قرآن حکیم کو وحی الٰہی تسلیم کرنے پر تیار نہیں، اور وہ اسے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ کی ذاتی تصنیف قرار دیتے ہیں؛ تاہم اس معاملے میں مایرؔ کا رخ قدرے مختلف ہے۔ بعض مقامات پر مایرؔ نے دیگر مستشرقین ہی کی طرح صاف طور پر رسول اللہ ﷺ کو قرآن حکیم کا "Author" یعنی مصنف قرار دیا ہے، تاہم بعض مقامات پر وہ آیات قرآنی کے تعلق سے "Revelation" یعنی "نزول" کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مایرؔ دیگر مستشرقین ہی کی طرح جوش عناد میں قرآن حکیم کو حضور سید عالم ﷺ کی ذاتی تصنیف قرار دینے کے شدید خواہاں ہیں لیکن جب قرآن حکیم کے مذکورہ چیلنجز کا سامنا ہوتا ہے تو وہ خود کو عاجز اور بے بس پاکر بادل نخواستہ قرآن حکیم کے لئے "نزول" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ خیر! قرآن حکیم کے اندر ذکر کئے گئے گزشتہ پیغمبروں کے واقعات پر انگلی اٹھاتے ہوئے ایک جگہ ولیئم مایرؔ ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ دعوی کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ نے یہ واقعات یہودی روایات سے اخذ کرکے قرآن حکیم کے اندر از خود شامل کردیئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"A new feature also appears in the appeal Which Mahomet now makes frequently in the Coran to the former scriptures and to the jews,as witnesses to his claim. His position is fortified by long and discursive narrative from Old Testament history, sus as the creation and fall of man, the flood, the stories of Abraham, David, and Solomon, given sometimes in the very language of the Bible, but overlaid and distorted by rabbinical fiction and conceits and sometimes also by native legends. There is evidently Jewish inspiration, but whence derived we have not the means of saying".[24]

ترجمہ:

اس اپیل میں ایک نئی خصوصیت بھی ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ (حضرت) محمد اب کثرت کے ساتھ قرآن میں سابق صحیفوں اور یہودیوں کو اپنے دعوے پر گواہ بناتے ہیں۔ اُن کی پوزیشن عہد نامہ قدیم کی طویل اور متضاد داستاں سے مضبوط ہوجاتی ہے؛ مثلاً انسان کی تخلیق اور زوال، سیلاب، (حضرت) ابراہیم، (حضرت) داؤد اور (حضرت) سلیمان کے واقعات بعض اوقات بائبل ہی کی زبان میں (بیاں ہوتے ہیں)؛ مگر تلمودی افسانوں، خیانتوں اور کبھی کبھی ملکی کہانیوں سے ڈھکے ہوئے اور مسخ شدہ۔ بلاشبہ یہ یہودی یا عبرانی الہام ہے مگر انہوں نے (یعنی رسول اللہ ﷺ نے) یہ کہاں سے اخذ کیا ہے؟ ہمارے پاس یہ کہنے کے ذرائع نہیں ہیں۔

تجزیہ:

پیش نظر پیراگراف میں ولیئم مایر کا الزام یہ ہے کہ حضور سید عالم ﷺ نے گزشتہ پیغمبروں کے احوال خود سے بناکر قرآن حکیم کے اندر شامل کردیئے ہیں۔ مضامین قرآن پر نظر رکھنے والا کوئی بھی شخص بدیہی نظر ہی میں یہ بتاسکتا ہے کہ مایرؔ کا یہ الزام فقط جوشِ عناد پر مبنی ہے، کیوں کہ مایرؔ کے دعوے کے مطابق اگر گزشتہ پیغمبروں کے واقعات رسول اللہ ﷺ نے یہودی روایات سے اخذ کرکے ازخود قرآن حکیم کے اندر شامل کردیئے ہوتے تو اس کے لئے ضروری ہوتا کہ آپ ﷺ پہلے ہی سے یہودی روایات کا علم رکھتے ہوں، جب کہ سیرت نبوی کا معروضی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہودیوں اور ان کے علوم و روایات سے رسول اللہ ﷺ کا تعارف ہجرت مدینہ کے بعد ہوا؛ کیوں کہ یہودی مدینے کے آس پاس آباد تھے، نہ کہ مکہ کے گرد و نواح میں۔ اچھا! وہ زمانہ ایسا بھی نہیں تھا کہ آج کی طرح ایک دوسرے کی روایات اور قدریں الگ الگ میڈیا پلیٹ فارم کے ذریعے ایک دوسرے تک پہنچتی رہتی تھیں، اور مکہ والے تو یوں بھی دوسروں کی تہذیب و روایات سے کوسوں دور رہتے تھے؛ اس لئے اُن دنوں کے حالات میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ہجرت مدینہ سے قبل حضور ﷺ یہودیوں کی روایات سے آگاہ ہوگئے ہوں۔ اس منظر نامے کو پیش نظر رکھ کر جب ہم مایرؔ کے الزام کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ الزام اول نظر ہی میں بے بنیاد بن جاتا ہے، کیونکہ حضور ﷺ کو یہودی روایات سے آگاہی ہجرت مدینہ کے بعد حاصل ہوئی جب کہ گزشتہ پیغمبروں کے اکثر احوال ہجرت مدینہ سے قبل ہی اللہ رب العزت کی جانب سے "مکی سورتوں" میں واضح کردیئے گئے تھے۔ معاملے کی کماحقہ توضیح کے لئے ہم مندرجہ ذیل پیراگراف میں اُن سورتوں کی ایک فہرست پیش کررہے ہیں جو جمہور علماء کے نزدیک مکی ہیں۔

سورۃ: الانعام، الاعراف، یونس، ھود، یوسف، ابراھیم، الحجر، النحل، الاسراء، الکھف، مریم، طه، الانبیاء، المومنون، الفرقان، الشعرا، النمل، القصص، العنکبوت، الروم، لقمان، السجدۃ، سبا، فاطر، یٰس، الصافات، ص، الزمر، المومن، حم السجدۃ، الشوری، الدخان، الجاثیة، الأحقاف، ق، الذاریات، الطور، النجم، القمر، الواقعة، الملك، القلم، الحاقة، المعارج، نوح، الجن، المزمل، المدثر، القیامة، الدھر، المرسلات، النبا، النازعات، عبس، التکویر، الانفطار، الانشقاق، البروج، الطارق، الاعلی، الغاشیة، الفجر، البلد، الشمس، الیل، الضحی، الشرح، التین، العلق، العادیات، القارعة، التکاثر، العصر، الھمزہ، الفیل، قریش، الماعون، الکوثر، الکافرون، المسد۔

اب آپ غور کریں کہ مایرؔ نے اپنے الزام میں انسان کی تخلیق، سیلاب، حضرت ابراہیم، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے واقعات کے تئیں یہ دعوی کیا کہ یہ واقعات حضور ﷺ نے ازخود بناکر قرآن مجید کے اندر شامل کردیئے ہیں۔ غور کرنے والی بات یہ ہے کہ تخلیق انسان اور ابلیس کے انکار سجدہ کا ذکر سورۃ: الاعراف میں، یوں ہی سورۃ: الحجر میں؛ حضرت نوح علیہ السلام اور سیلاب کا ذکر سورۃ: ہود میں؛ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر سورۃ: الانعام، سورۃ: ہود، سورۃ: ابراہیم سورۃ: الانبیاء اور سورۃ: الصافات وغیرہ میں؛ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر سورۃ: الانعام، سورۃ: الاسراء، سورۃ: الانبیاء، سورۃ: نمل، سورۃ: سبا اور سورۃ: ص میں اور حضرت سلیمان کا ذکر سورۃ: الانعام، سورۃ: الانبیاء، سورۃ: نمل، سورۃ: سبا اور سورۃ: ص میں موجود ہے؛ اور یہ تمام کی تمام سورتیں متفقہ طور پر مکی ہیں، یعنی یہ سورتیں ہجرت مدینہ سے قبل مکہ مکرمہ ہی میں نازل ہوگئی تھیں۔ اب آپ مجھے بتائیں کہ جب مایرؔ کے ذکر کردہ واقعات قرآن مجید کے اندر مکی سورتوں میں موجود ہیں اور شواہد کے مطابق رسول اللہ ﷺ کو یہودی روایات سے آگاہی ہجرت مدینہ کے بعد حاصل ہوئی تو پھر آپ ﷺ نے ہجرت مدینہ سے قبل ہی کس طرح مکی سورتوں میں یہودی روایات کو اپنی طرف سے بناکر قرآن مجید کے اندر شامل کردیا؟؟ اچھا! صرف مایرؔ کے ذکر کردہ واقعات ہی نہیں بلکہ مکی سورتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ پیغمبروں سے متعلق اکثر واقعات ہجرت مدینہ سے قبل مکہ مکرمہ ہی میں نازل ہوگئے تھے۔ آپ اس بات کی تحقیق اوپر پیش کی گئی مکی سورتوں کے مضامین سے خود بھی کرسکتے ہیں۔ اب ایسی صورت میں مایرؔ کا یہ کہنا کہ "گزشتہ پیغمبروں کے واقعات رسول اللہ ﷺ نے ازخود بناکر قرآن مجید کے اندر شامل کردیئے ہیں" ایک نہایت ہی بیہودہ، غیر مناسب اور بے بنیاد بات ہے۔

اگر آپ مزید غور کریں تو معلوم ہو گا کہ قرآن حکیم کو "اگلوں کی کہانیاں" بتانا یا پھر رسول اللہ ﷺ کی ذاتی تصنیف قرار دینا مستشرقین کی جانب سے اسلام کے خلاف آزمایا جانے والا کوئی جدید ترین حربہ نہیں ہے بلکہ مستشرقین سے پہلے یہ کام ان کے معنوی اجداد یعنی کفار عرب کیا کرتے تھے، چنانچہ مستشرقین کے معنوی اجداد کی ان بیہودہ باتوں اور پھر ان کے جواب کی وضاحت کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے سورۃ: الفرقان میں فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۚ وَقَالُوْٓا

أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۔ قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا}[25]

یعنی: اور کفار نے کہا کہ یہ (قرآن) ایک بہتان ہے جو انہوں نے (حضور ﷺ نے) بنالیا ہے، اور دوسرے لوگوں نے اس میں ان کی مدد کی ہے۔ یہ لوگ ظلم اور جھوٹ پر اتر آئے ہیں۔ اور کفار نے کہا کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو انہوں نے لکھ لی ہیں، تو وہ کہانیاں صبح وشام ان پر پڑھی جاتی ہیں۔ (اے نبی!) آپ فرمادیجئے کہ اس قرآن کو اُس نے اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ باتیں جانتا ہے، بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

سورۃ: الانفال میں اللہ رب العزت نے فرمایا:

{وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ} [26]

اور جب اُن کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں: (یہ کلام) ہم نے سن لیا ہے اگر ہم چاہیں تو اسی طرح کا (کلام) ہم بھی کہہ دیں، اور یہ تو صرف اگلے لوگوں کی کہانیاں ہی ہیں۔

دیکھا آپ نے؟ جو بات ولیم مایر آج کہہ رہے ہیں وہی بات صدیوں پہلے کفار عرب بھی کہا کرتے تھے؛ یعنی آج ولیم مایر قرآن حکیم کے اندر ذکر کئے گئے گزشتہ پیغمبروں کے واقعات کو یہودی روایات سے ماخوذ اور رسول اللہ ﷺ کی ذاتی کاوش بتارہے ہیں اور عہد نبوی میں یہی بات کفار عرب بھی کہہ رہے تھے۔ کفار عرب اور مستشرقین مغرب میں دوسری مماثلت یہ ہے کہ قرآنی چیلنج {اگر تم قرآن کو اللہ عزوجل کا کلام تسلیم نہیں کرنا چاہتے تو تم قرآن کی طرح فقط ایک ہی سورت لاکر دکھاؤ، اور ہاں! اگر تم یہ کام تنہا سرانجام نہیں دے سکتے تو پوری دنیا کے جن وانسان کو بھی اپنی مدد کے لئے بلالو} کے سامنے کل کفار عرب بے بس تھے اور آج مستشرقین مغرب بے بس ہیں؛ مگر اس بے بسی اور لاچاری کے باوجود نہ تو کل کفار عرب نے اپنی ٹیڑھی روش سے رجوع کیا تھا اور نہ آج یہ مستشرقین مغرب کررہے ہیں۔ خیر! مایر کے گزشتہ الزام کے تئیں ہم فی الحال یہی کہہ رہے ہیں کہ اگر قرآن حکیم کے اندر ذکر کئے گئے گزشتہ پیغمبروں کے واقعات کو رسول اللہ ﷺ نے یہودی روایات سے اخذ کرکے ازخود قرآن حکیم کے اندر شامل کردیا تھا تو آپ بھی یہودی روایات سے اخذ کرکے اسی طرح کا ایک واقعہ بیان کرکے دکھائیں اور اس کام میں اپنے تمام ساتھی مستشرقین کے علاوہ تمام ہم نوا عربوں کو بھی ساتھ ملالیں؛ اور اگر آپ تمام جن وبشر کے ساتھ مل کر بھی قرآنی فصاحت وبلاغت اور مستقبل کی خبروں کے ساتھ کوئی واقعہ بیان نہیں کرسکتے، اور یقینا نہیں کرسکتے، تو پھر یہ مان لیجئے کہ گزشتہ پیغمبروں کے واقعات کو حضور ﷺ نے ازخود یہودی روایات سے اخذ کرکے قرآن حکیم کے اندر شامل نہیں کیا تھا بلکہ یہ وہ واقعات ہیں جنہیں خود اللہ رب العزت نے ایک بے مثال اسلوب کے ساتھ قرآن حکیم کے اندر بیان کیا ہے۔

نوٹ:

لگے ہاتھوں یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ مایر نے زیر بحث پیراگراف میں قرآن حکیم کے اندر ذکر کئے گئے واقعات کو مسخ شدہ اور خیانت سے پُر بتایا ہے۔ اس تعلق سے یہ عرض ہے کہ قرآن حکیم کے اندر ذکر کئے گئے واقعات ہرگز بھی مسخ شدہ یا خیانت پر مبنی نہیں ہیں بلکہ خیانت مایر کے ذہن میں اور مسخ شدہ تصویر مایر کے مطالعے میں ہے۔ مایر کا یہ الزام یقینی طور پر دوحال سے خالی نہیں ہے، اور وہ یہ کہ مایر یا تو فی الواقع قرآن مجید کا حقیقی انداز سمجھ نہیں پارہے ہیں یا پھر وہ جان بوجھ کر محض مذہبی عصبیت کی بنیاد پر قرآن حکیم پر یہ سطحی الزام عائد کررہے ہیں۔

مطالعہ قرآن کے وقت ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ قرآن بنیادی طور پر کوئی قصے کہانی کی کتاب نہیں بلکہ "کتاب ہدایت" ہے، اور اسی لئے قرآن حکیم کے اندر گزشتہ پیغمبروں یا اقوام وملل کے جو احوال ذکر کئے گئے ہیں وہ مستقل سورتوں میں تفصیل کے ساتھ ذکر نہیں کئے گئے ہیں؛ کیوں کہ اگر ایسا کیا جاتا تو قرآن حکیم کا اصل مقصد ہی کہیں گم ہوکر رہ جاتا۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ قرآن حکیم کا اصل مقصد بندگان خدا کی ہدایت ہے اور یہ انسان کا مزاج ہے کہ اگر اس کے سامنے تفصیل کے ساتھ اور خوبصورت لب ولہجے میں واقعات بیان کئے جائیں تو اس کا ذہن واقعات کی تفصیلات میں گم ہوکر اصل سبق سے بہت دور چلا جاتا ہے، اور قرآن ہرگز بھی یہ روا نہیں سمجھتا کہ اس کا قاری دوران مطالعہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے اصل مقصد یعنی "حصول ہدایت" سے دور چلا جائے، کیوں کہ اگر ایسا ہونے لگے تو نزول قرآن کا اصل مقصد ہی خطرے میں پڑجائے گا؛ اسی لئے قرآن حکیم کے اندر واقعات کہیں بھی تفصیل کے ساتھ اور پے درپے بیان نہیں کئے گئے ہیں بلکہ موقع وموسم کی مناسبت سے محض حصول ہدایت کے لئے انہیں تھوڑا تھوڑا کرکے بیان کردیا گیا ہے۔ اب قرآن حکیم کے مقصد حقیقی اور خاص پیرایے سے آنکھیں بندکرکے اگر ولیم مایر قرآن حکیم میں موجود واقعات کی اعتمادیت پر انگلی اٹھارہے ہیں تو یقینی طور پر یہ ان کی فہم کی خطا ہے، نہ کہ قرآن حکیم کے انداز واسلوب اور مواد ومضامین کی۔

باب دوم:

حصہ اول کے پہلے باب میں ولیئم مایرؔ نے اور بھی بہت سی قابل اعتراض بلکہ ناقابل قبول باتیں کہی ہیں تاہم چوں کہ اگر ہم یہاں مایرؔ کی پوری کتاب کا تجزیہ کرنے بیٹھ جائیں تو یقینی طور پر یہ تجزیاتی تحریر مایرؔ کی کتاب سے بھی زیادہ طویل ہوجائے گی، اس لئے حصہ اول کے پہلے باب کے تئیں اتنے ہی تجزیات اور تعقبات پر اکتفا کرتے ہوئے ہم حصہ اول کے باب دوم کی طرف بڑھتے ہیں۔

دوسرے باب میں ولیئم مایرؔ نے بنیادی طور پر سورتوں اور آیتوں کی ترتیب اور اعتباریت سے بحث کی ہے؛ اور اس باب کا عنوان انہوں نے ”CompilationAndArrangementOfTheCoran“ منتخب کیا ہے۔ اس باب کے چند ناگفتہ بہ مندرجات یہ ہیں:

کیا قرآن کے کچھ حصے غائب ہیں؟

ولیئم مایرؔ کا ایک خیال یہ ہے کہ موجودہ قرآن حکیم مکمل نہیں ہے، یعنی قرآن حکیم کے کچھ ابتدائی حصے پیش نظر مجموعہ سے غائب ہیں۔

حسب عادت اپنے اس خیال کو بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے محض اپنے مزعومات کی بنا پر تحریر کا جامہ پہناتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"It is possible that some of the earlier and of the more ephemeral fragments which proceeded from Mahomet may have before his death become obsolete,and thus escaped collection; but the pious veneration with which the whole body of the Mussulmans from the first regarded the Revelation is the word of God, the devotion with which they committed it to memory, and the evidence that transcripts existed even from an early period of Mahomet's ministry, combined with the fact that Zeid's collection came into immediate and unquestioned use,___ all this leaves no doubt in the mind that the Coran as we read it now contains the very words delivered by the Prophet"[27].

ترجمہ:

ایسا ممکن ہے کہ کچھ ایسے عارضی اور اولین ٹکرے جنہیں (حضرت) محمد (ﷺ) نے (اپنے اظہار نبوت کے آغاز میں) جاری کئے تھے وہ اُن کی وفات سے پہلے ہی متروک الاستعمال ہوگئے ہوں، اور یوں وہ مجموعہ میں شامل ہونے سے رہ گئے ہوں؛ مگر دنیا بھر کے مسلمان جس پاکیزہ تعظیم کے ساتھ روز اول ہی سے یہ مانتے ہیں کہ یہ الہام اللہ کا کلام ہے، جس عقیدت کے ساتھ وہ اسے یاد کرتے ہیں، اور اس بات کا ثبوت کہ نقلیں بھی (حضرت) محمد (ﷺ) کی امامت کے ابتدائی زمانے ہی سے موجود تھیں، ساتھ ہی یہ حقیقت بھی کہ زید نے زمانہ رسالت سے متصل ہی مسلم اور بے شبہ طریقے پر اپنا کام پورا کیا؛ یہ ساری باتیں ذہن میں کوئی شک نہیں چھوڑتیں کہ قرآن کو جس طرح ہم آج پڑھتے ہیں یہ بعینہ وہی الفاظ ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے پیش کئے تھے۔

تجزیہ:

متذکرہ بالا پیراگراف پڑھنے کے بعد مجھے سورۃ: البقرۃ کی یہ آیت کریمہ شدت کے ساتھ یاد آرہی ہے:

{خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ}[28]

یعنی: اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ بلاشبہ ولیئم مایرؔ ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں جن کے دلوں اور کانوں پر اللہ رب العزت نے مہر لگادی ہے اور جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے؛ کیوں کہ اگر مایرؔ کے حواس پوری طرح درست اور فعال ہوتے تو وہ بھلا اس بات کا دعوی کیسے کرسکتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں قرآن حکیم کے کچھ حصے غائب ہوگئے تھے؟ ذرا سوچئے کہ رسول اللہ ﷺ ابھی بقید حیات ہیں اور قرآن کریم کے کچھ حصے غائب ہوگئے! کیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟ اگر فی الواقع ایسا ہے تو پھر اُس حدیث کا کیا بنے گا جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے؟ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں:

”كان يعرض على النبى ﷺ القرآن كل عام مرة،فعرض عليه مرتين فى العام الذى قبض فيه؛ وكان يعتكف كل عام عشرا فاعتكف عشرين فى العام الذى قبض فيه۔“

یعنی: حضرت جبرئیل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہر سال ایک مرتبہ قرآن حکیم کا دور کیا کرتے تھے لیکن جس سال آپ ﷺ کا وصال ہوا اُس

سال دو مرتبہ دور فرمایا۔ یوں ہی رسول اللہ ﷺ ہر سال دس روز اعتکاف کیا کرتے تھے لیکن جس سال آپ ﷺ نے وفات پائی اُس سال آپ ﷺ نے بیس روز اعتکاف فرمایا۔۔۔ اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں، بخاری نے اپنی صحیح میں، ابوداؤد نے اپنی سنن میں، ابن ماجہ نے اپنی سنن میں، نسائی نے السنن الکبری میں، دارمی نے اپنی سنن میں اور بیہقی نے السنن الکبری میں اپنی اپنی سندوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے کچھ حصے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں غائب ہوگئے تھے تو پھر جبرئیل امین رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کس قرآن کا دور فرمایا کرتے تھے؟ کیا آپ کے خیال میں حضرت جبرئیل کو بھی مفروضہ غائب شدہ حصوں کے بارے میں خبر نہیں تھی؛ جب کہ وہ فرشتے ہیں اور فرشتوں سے خطا و نسیان محال ہیں؟

دوسری بات یہ کہ ولیئم مایر بذات خود اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ نزول وحی کے وقت باقاعدہ طور سے کتابت قرآن کا اہتمام کیا جاتا تھا اور ان کی نقلیں دور خلافت میں یقینی طور پر موجود تھیں، اور ان ہی نقلوں کی بنا پر قرآن حکیم کی تدوین عمل میں آئی؛ کیا ان اعترافات کے باوجود یہ کہنا کہ "قرآن حکیم کے کچھ حصے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں غائب ہوگئے ہیں" ایک ایسی ہی بات نہیں ہے کہ سورج کی کرنوں کے وجود کا اقرار بھی کیا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے کہ ابھی رات ہوگئی ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ عہد صدیقی میں جب حضرت زید بن ثابت نے تدوین قرآن کا کام شروع کیا تو سورۃ برأت کی آخری دو آیتیں انہوں نے اس وقت تک درج نہیں کیں جب تک کہ انہیں یہ دو آیتیں حضرت ابوخزیمہ انصاری کے پاس تحریری طور پر نہیں مل گئیں؟؟ ذرا سوچ کر دیکھیں کہ عہد صدیقی میں بیشتر اکابر صحابہ موجود تھے اور ان میں ایک بڑی تعداد ایسے صحابہ کی بھی تھی جنہوں نے پورا قرآن حکیم حفظ کر رکھا تھا، اس سے بڑھ کر یہ کہ کاتبان وحی بھی ابھی بقید حیات تھے؛ اس کے باوجود حضرت زید نے اپنی یا کسی اور کی یادداشت پر اعتماد نہیں کیا اور انہوں نے وہ نقل ڈھونڈ نکالی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تحریر کروائی تھی۔ کیا اتنے سخت اہتمام اور حد درجہ احتیاط کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ موجودہ مجموعہ میں قرآن حکیم کی کوئی آیت شامل ہونے سے رہ گئی ہو؟؟

سیاق وسباق کی عدم موجودگی اور آیتوں کی غیر مہذب ترتیب کا الزام:

قرآن حکیم پر ولیئم مایر کا ایک الزام یہ بھی ہے کہ آیتوں کے سیاق وسباق سے مفہوم کا تعین نہیں ہوتا اور ساتھ ہی آیتیں بھی غیر فنی طریقے پر ترتیب دی گئی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"The Coran has this drawback, that we are never sure of the context. While some Suras, especially the shorter chapters, the lyrics, and narrative portions, are more or less complete, and presumably in the form in which they were first promulgated, there prevails throughout the great body of the work an disregard of chronological sequence. There are not only startling breaks and gaps, but later passages not unfrequently precede the earlier. The fragments have been set with artless simplicity". [29]

ترجمہ:

قرآن کے اندر یہ عیب موجود ہے کہ ہمیں سیاق و سباق کے بارے میں کبھی یقین نہیں ہوتا۔ کچھ سورتیں، خصوصیت کے ساتھ چھوٹی سورتیں، نغمات اور واقعاتی حصے کم و بیش مکمل ہیں؛ اور ممکنہ طور پر یہ اسی شکل میں ہیں جس میں وہ پہلی مرتبہ جاری کی گئی تھیں۔ کتاب کے پورے متن میں تاریخ کی ترتیب نظر انداز کی گئی ہے، (درمیان میں) نہ صرف حیرت انگیز وقفے اور خلاء موجود ہیں بلکہ مابعد والی عبارتیں بھی ماقبل والی عبارتوں سے شاذ ونادر بھی آگے نہیں بڑھتیں۔ آیتوں کے ٹکرے بھی ناپختہ اور غیر فنی طریقے پر ترتیب دیئے گئے ہیں۔

یوں ہی صفحہ نمبر ۴۰ رہی میں ایک مقام پر ولیئم مایر کہتے ہیں:

"It will also be understood that there are great portions of the Coran which, having nothing very characteristic about them, it is hardly possible on sufficient ground to assign to any specific period, and the arrangement of which must therefore rest on purely arbitrary assumption".[30]

ترجمہ:

اس سے یہ بھی سمجھا جائے گا کہ قرآن کا ایک بڑا حصہ ایسا حصہ ہے جسے کافی بنیادوں پر کسی خاص زمانے کی جانب منسوب کرنا اس لئے بمشکل ممکن ہوپاتا ہے کہ وہ حصہ اپنے تئیں کوئی خصوصیت نہیں رکھتا؛ اور اسی لئے اس کی ترتیب بھی خالصتًا بے قاعدہ مفروضے پر رکھی گئی ہے۔

تجزیہ:

اگر آپ متذکرہ بالا دونوں اقتباس کا گہری نظر کے ساتھ مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مایرؔ نے ان عبارتوں میں کئی دعوے پیش کئے ہیں۔

اول: یہ کہ قرآن حکیم کے اندر سیاق وسباق سے آیتوں کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہے۔

دوم: یہ کہ آیتیں غیر فنی طریقے پر ترتیب دی گئی ہیں۔

سوم: یہ کہ متن قرآن کی تدوین کے وقت تاریخ نزول کی ترتیب نظر انداز کردی گئی ہے؛ اور

چہارم: یہ کہ قرآن حکیم کا کچھ حصہ ایسا ہے جسے کسی خاص زمانے کی جانب منسوب کرپانا بہت مشکل ہے۔

اب ان چار دعووں میں سے چوتھے دعوے کے بارے میں یہ عرض ہے کہ: ہاں! قرآن حکیم کی کچھ سورتیں ایسی ضرور ہیں جن کے مکی یا مدنی ہونے میں علماء کرام کے مابین اختلاف ہے۔ مثلا امام سیوطی نے سورۃ: الفاتحۃ، سورۃ: النساء، سورۃ: یونس، سورۃ: الرعد، سورۃ: الحج، سورۃ: الفرقان، سورۃ: یسین، سورۃ: ص، سورۃ: محمد، سورۃ: الحجرات، سورۃ: الرحمٰن، سورۃ: الحدید، سورۃ: الصف، سورۃ: الجمعۃ، سورۃ: التغابن، سورۃ: الملک، سورۃ: المطففین، سورۃ: الأعلی، سورۃ: الفجر، سورۃ: البلد، سورۃ: الیل، سورۃ: القدر، سورۃ: لم یکن، سورۃ: زلزلۃ، سورۃ: والعادیات، سورۃ: الھاکم التکاثر، سورۃ: الماعون، سورۃ: الکوثر، سورۃ: الاخلاص، سورۃ: الفلق اور سورۃ: الناس کے بارے میں "الاتقان" میں دلائل کے ساتھ بتایا ہے کہ یہ سورتیں مکے میں نازل ہوئیں یا مدینے میں؟ اس بارے میں علماء کرام کے درمیان اختلاف ہے؛ تاہم اس اختلاف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زیر بحث سورتوں کے مفہوم اور مواد سے ان کے کسی خاص زمانہ نزول کا تعین کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اختلاف کا مطلب بس اتنا ہے کہ الگ الگ لوگوں نے الگ الگ دلیلوں کے ساتھ اپنی اپنی باتیں کہی ہیں تاہم دلائل کی معروضی تجزیہ آرائی سے کافی حد تک واضح ہوجاتا ہے کہ کون سی سورت فی الواقع مکی ہے اور کون سی مدنی؟ مثلا سورۃ: الفاتحہ کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ یہ سورت مدینے میں نازل ہوئی لیکن سورۃ: الفاتحہ کے مواد اور حقائق کو کھنگالنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ سورت مدنی نہیں بلکہ مکی ہے۔ آپ دلیلیں "الاتقان" میں جاکر دیکھ لیں۔ تو کہنے کا منشا یہ ہے کہ بعض سورتوں کے مکی و مدنی ہونے میں بے شک علمائے کرام کے مابین اختلاف ہے تاہم مواد اور مفہوم کی چھان بین سے بڑی حد تک یہ منظر صاف ہوجاتا ہے کہ وہ سورتیں فی الواقع مکی ہیں یا مدنی؟ اس لئے مایرؔ کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ:

"قرآن حکیم کا کچھ حصہ ایسا ہے جسے کسی خاص زمانے کی جانب منسوب کرپانا بہت مشکل ہے" بلکہ انہیں یوں کہنا چاہئے کہ: "قرآن حکیم کی بعض سورتیں ایسی ہیں جن کے مکی و مدنی ہونے میں علماء و مفکرین کے مابین اختلاف ہے۔"

ولیئم مایرؔ کے تیسرے دعوے "متن قرآن کی تدوین کے وقت تاریخ نزول کی ترتیب نظر انداز کردی گئی ہے" کے بارے میں یہ عرض ہے کہ اس نکتے پر ہم نے زیر نظر تحریر کے پہلے تجزیے "مضامین کے الجھاؤ اور تعذر فہم کا الزام" کے تحت کافی تفصیلی گفتگو رقم کردی ہے۔ آپ وہاں جاکر وہ ملاحظہ فرمالیں۔

مایرؔ کے دوسرے دعوے "آیتیں آرٹ لیس یا غیر مہذب طریقے پر ترتیب دی گئی ہیں" کے متعلق عرض ہے کہ زیر نظر تحریر کے پہلے تجزیے "مضامین کے الجھاؤ اور تعذر فہم کا الزام" کے تحت ہم نے سورتوں کی ترتیب پر بھی تفصیل کے ساتھ گفتگو ہے جہاں سے آپ آیتوں کی ترتیب کا حال بھی معلوم کرسکتے ہیں؛ تاہم چوں کہ یہاں مایرؔ نے خصوصیت کے ساتھ آیتوں کی ترتیب پر اظہار خیال کیا ہے اس لئے ہم بھی یہاں چند سطریں خصوصیت کے ساتھ ترتیب آیات ہی کی نذر کرتے ہیں۔

مایرؔ کا کہنا ہے کہ آیتیں غیر مہذب طریقے پر ترتیب دی گئی ہیں۔ اس عبارت سے غالبًا ان کی مراد یہ ہے کہ کتب عامہ کی طرز پر جداگانہ مفہوم کے حساب سے جداگانہ ذیلی فصلیں قائم کرکے آیتیں ترتیب نہیں دی گئی ہیں۔ اس خصوص میں پہلا عرض یہ ہے کہ آیتوں کی ترتیب مکمل طور پر توقیفی اور تعلیمی ہے؛ یعنی اللہ عز وجل نے یہ ترتیب حضرت جبرئیل امین کو سکھائی، جبرئیل امین نے یہ ترتیب حضور سید عالم ﷺ کو بتائی اور پھر آقا علیہ الصلوۃ والتسلیم نے یہ ترتیب صحابہ کرام کو سکھائی۔ اس دعوے کی ایک دلیل امام ابوالقاسم کرمانی کے حوالے سے حوالہ نمبر ۸ر میں یہ گزر چکی ہے کہ جب نزول

کے اعتبار سے آخری آیت {وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ} نازل ہوئی تو حضرت جبرئیل نے فرمایا: یارسول اللہ! اس آیت کو "آیت ربا" اور "آیت دین" کے مابین مرتب کریں؛ تو گویا آیتوں کی پوری ترتیب وحی الٰہی کے ذریعے قائم کی گئی ہے۔ اس تعلق سے حضرت زید بن ثابت سے بھی ایک روایت موجود ہے، وہ کہتے ہیں:

"کنا عند رسول اللہ ﷺ نؤلف القرآن من الرقاع۔"[31]

یعنی: ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس چرمی ٹکروں میں قرآن کی تالیف کرتے تھے۔

یہ روایت بیان کرنے کے بعد امام حاکم (۳۲۱-۴۰۵ھ/ ۹۳۳-۱۰۱۴ء) نے کہا ہے:

"اس میں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن عہد نبوی ﷺ ہی میں جمع کرلیا گیا تھا۔"[32]

امام جلال الدین سیوطی (۸۴۹-۹۱۱ھ/ ۱۴۴۵-۱۵۰۵ء) حضرت زید کی متذکرہ بالا روایت کے پس منظر میں امام بیہقی (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶ء) کے حوالے سے لکھتے ہیں: "بیہقی نے کہا ہے: یہاں چرمی ٹکروں میں قرآن کی تالیف کا مناسب مطلب یہ ہے کہ وہ نازل شدہ متفرق آیتوں کو ان کی سورتوں میں ترتیب کے ساتھ جمع کرتے تھے؛ اور یہ سارا کام رسول اللہ ﷺ کے اشارے سے انجام پذیر ہوتا تھا۔"[33]

اس پوری گفتگو کا حاصل یہ نکلا کہ آیتوں کی ترتیب قطعی طور پر توقیفی اور تعلیمی ہے؛ یعنی اللہ رب العزت نے یہ ترتیب حضرت جبرئیل کو سکھائی، پھر جبرئیل امین نے یہ ترتیب حضور اکرم ﷺ کو بتائی اور پھر آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ ترتیب صحابہ کرام کو سکھائی؛ اور پھر اس طریقے پر قرآنی آیتوں کی ترتیب کا کام اپنے انجام تک پہنچا۔ اب ایسی صورت میں ولیئم مایر کا یہ کہنا کہ "آیتیں غیر مہذب اور غیر فنی طریقے پر جمع کی گئی ہیں" ایک نہایت ہی غلط اور بے بنیاد بات ہے۔

ولیئم مایر کے پہلے دعوے "قرآن حکیم کے اندر سیاق و سباق سے آیتوں کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہے" کے تعلق سے یہ عرض ہے کہ: قرآن حکیم کے اندر سیاق و سباق سے آیتوں کا مفہوم متعین کرنا بالکل بھی مشکل نہیں ہے۔ مثلا: سورۃ: البقرۃ کو لے لیجئے! حروف مقطعات کے بعد {ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ} کے ذریعے سب سے پہلے قرآن کے موضوع اور غرض و غایت پر روشنی ڈالی گئی ہے، بایں طور کہ اس محکم اور بے شبہ کتاب کا موضوع "تقوی شعار افراد کی ہدایت" ہے۔ اور چوں کہ موضوع ہی کے بین السطور سے ہمیں غرض و غایت کا بھی علم ہوجاتا ہے اس لئے غرض و غایت پر الگ سے روشنی نہیں ڈالی گئی، کیوں کہ یہ "تحصیل حاصل" ہے جو بلاشبہ باطل ہے۔ اب ماقبل میں موضوع اور غایت کے تحت چوں کہ "متقیوں" کا ذکر آگیا اس لئے اللہ عزوجل نے اگلی کئی آیتوں میں متقیوں کے احوال اور صفات سے ہمیں آگاہ کیا تاکہ بات پوری طرح ذہن نشیں ہوجائے۔ بعد ازاں! آیت نمبر ۶ {إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا} سے کفار و مشرکین کے کچھ احوال بیان کئے گئے، بلفظ دیگر یہاں "مفہوم مخالف" کے ذریعے متقیوں کا مفہوم واضح کیا گیا کہ جس شخص کے اندر یہ باتیں موجود ہوں گی وہ ہرگز بھی متقی نہیں ہوسکتا، اور اس کے لئے یہ کتاب ذریعہ ہدایت بھی نہیں بنے گی۔ کفار و مشرکین کی صفات پر روشنی ڈالنے کے بعد آیت نمبر ۸/ {وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ} سے لے کر اگلی کئی آیتوں تک منافقین کے احوال بیان کئے گئے، کیوں کہ کفار و مشرکین کے ساتھ منافقین کا بڑا ہی گہرا رشتہ ہے بلکہ حقیقی معنوں میں یہ منافقین کفار و مشرکین سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ یوں ہی آپ آگے بڑھتے چلے جائیں، اگر اللہ نے آپ کو قرآنی بصیرت عطا فرمائی ہے تو آپ آیتوں کے درمیان ایک غیر معمولی ربط کا احساس کئے بغیر رہ نہیں پائیں گے؛ لیکن اگر آپ کو آیتوں کے درمیان کوئی ربط نظر نہیں آتا یا پھر آپ سیاق و سباق سے مفہوم آیات کا تعین نہیں کرپاتے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ آپ قرآنی بصیرت سے محروم ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کو اپنی قوت ادراک کا ماتم کرنا چاہئے، نہ کہ آیات قرآنی پر بے ربط ہونے کا بے جا الزام عائد کرنا چاہئے۔

یہاں آیات قرآنی کی تفہیم کے تحت یہ بات بھی یاد رکھیں کہ قرآن حکیم کی بعض آیتیں ایسی ہیں جن کی تفہیم اسباب نزول کی معرفت کے بغیر ایک بہت ہی مشکل مسئلہ ہے، اس لئے اگر آپ صحیح معنوں میں قرآن حکیم کی تفہیم کے خواہاں ہیں تو علوم قرآن پر بھی عبور حاصل کیجئے، کیوں کہ ان بنیادی ادراکات کے بغیر ولیئم مایر کی طرح آپ کو نہ تو قرآنی آیتوں میں ربط نظر آئے گا اور نہ ہی سیاق و سباق سے مفہوم کا تعین کرپائیں گے؛ گویا کمی آپ میں ہوگی لیکن آپ اپنی کمی کو چھپانے کے لئے قرآن حکیم کے الہامی اسلوب اور بے نظیر انداز پر سوالیہ نشان قائم کریں گے۔

کیا اٹھارہ سورتیں منزل من السماء نہیں ہیں؟

ولیئم مایر نے اپنی نجی فہم کے مطابق قرآن حکیم میں موجود ۱۱۴/ سورتوں کی ایک تاریخی ترتیب قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی یہ

ترتیب چھ تاریخی ادوار پر مبنی ہے۔ مایر نے اپنی اس نجی ترتیب میں جس علمی خیانت اور مذہبی عصبیت کا ثبوت دیا ہے وہ صرف اہل مغرب ہی کا خاصہ ہے۔ قرآن حکیم پر ایک نہایت ہی ڈراؤنا اور بے بنیاد الزام عائد کرتے ہوئے اپنے قائم کردہ ”دور اول“ کی سورتوں کے تئیں مایرؔ کہتے ہیں:

"First Period.___ Eighteen Suras: CIII., C., XCIX., XCI., CVI., I., XCV., CII., CIV., LXXXII., XCII., CV., LXXXIX., XC., XCIII., XCIV., CVIII. These are all short rhapsodies, some of only one or two lines. They may have been composed before Mahomet had conceived the idea of a divine mission,or of a Revelation communicated to him direct from heaven. None of them are in the form of a message from the Deity" [34].

ترجمہ:

پہلا دور۔ اٹھارہ سورتیں: ۱۰۳(سورۃ العصر)، ۱۰۰(سورۃ العادیات)، ۹۹(سورۃ الزلزلۃ)، ۹۱(سورۃ الشمس)، ۱۰۶(سورۃ قریش)، ۱(سورۃ الفاتحۃ)، ۹۵(سورۃ التین)، ۱۰۲(سورۃ التکاثر)، ۱۰۴(سورۃ الھمزۃ)، ۸۲(سورۃ الانفطار)، ۹۲(سورۃ اللیل)، ۱۰۵(سورۃ الفیل)، ۸۹(سورۃ الفجر)، ۹۰(سورۃ البلد)، ۹۳(سورۃ الضحیٰ)، ۹۴(سورۃ الم نشرح)، ۱۰۸(سورۃ الکوثر)۔

یہ تمام مختصر پرجوش سورتیں ہیں جن میں سے بعض تو فقط ایک یا دو سطروں پر مشتمل ہیں۔ شاید یہ مختصر پرکیف سورتیں (حضرت) محمد (ﷺ) کی جانب سے ایک روحانی مشن کا آئیڈیا لگانے یا جنت سے بلاواسطہ ان کے پاس الہام آنے سے پہلے ہی مرتب کر لی گئی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی اللہ عزوجل کے پیغام کی شکل میں نہیں ہے۔

تجزیہ:

ہم نے آغاز گفتگو ہی میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ بلند وبالا آواز میں تحقیق و جستجو کا دعوی کرنے والے مستشرقین کے یہاں ایک عام ذہنی بیماری یہ ہے کہ وہ محض مفروضوں اور مزعومات کی بنیاد پر بات کرتے ہیں۔ بلاشبہ مایرؔ کا مذکورہ بالا دعوی بھی فقط ان کے ذاتی مزعومات پر مبنی ہے۔ ہم نے ”رسول اللہ ﷺ پر قرآن کی کچھ آیتیں بذات خود ترتیب دینے کا الزام“ والی فصل میں تفصیل کے ساتھ اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ قرآن حکیم من و عن اللہ کا کلام ہے۔ اس حوالے سے سورۃ: البقرۃ کی آیت نمبر ۲۳/ کی روشنی میں قرآن حکیم کا یہ چیلنج پیش کیا تھا کہ اگر کسی کو بھی اس بات پر اعتراض ہے کہ پورا قرآن یا قرآن حکیم کا کوئی بھی حصہ کلام الٰہی نہیں ہے تو وہ قرآنی سورتوں جیسی محض ایک چھوٹی سی سورت ہی بنا کر دکھائے؛ یعنی اس کی بنائی ہوئی سورت نظم، وصف، فصاحت، بلاغت، معانی، اسلوب اور ماکان ومایکون کے رازہائے سربستہ وا کرنے میں قرآنی سورتوں جیسی ہو۔ اگر وہ نہیں بنا سکتا، اور یقینا نہیں بنا سکتا، تو پھر وہ لازمی طور پر یہ مان لے کہ قرآن حکیم ”الم“ سے لے کر ”والناس“ تک اللہ کا کلام ہے۔ واضح رہے کہ قرآن حکیم کا یہ چیلنج سورۃ: البقرۃ کے علاوہ سورۃ: یونس کی آیت نمبر ۳۸، سورۃ: ہود کی آیت نمبر ۱۳، سورۃ: الاسراء کی آیت نمبر ۸۸/ اور سورۃ: الطور کی آیت نمبر ۳۴/ میں بھی موجود ہے۔

باب سوم:

گزشتہ کئی صفحات کے اندر حصہ اول کے دوسرے باب میں موجود ولیئم مایرؔ کے چند ناقابل قبول مندرجات کا تجزیہ پیش کیا گیا۔ اب ہم یہاں حصہ اول کے تیسرے باب سے متعلق کچھ عرض کرتے ہیں۔

حصہ اول کے تیسرے باب کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس باب میں ولیئم مایر نے بنیادی طور پر اسلامی عقائد و نظریات اور پیغمبر اسلام ﷺ کی عائلی اور مذہبی زندگی کو اپنی بے جا تنقیدات کا شکار بنایا ہے، اور چوں کہ زیر نظر مقالے کا مرکزی پلاٹ " مطالعہ قرآن " ہے اس لئے ہم یہاں اِس باب کے مباحث کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالی ایک مستقل مقالے میں ہم ان مباحث کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

آخری بات:

ہم نے آغاز سخن میں یہ بتایا تھا کہ مایرؔ نے اپنی یہ کتاب دو حصوں میں ترتیب دی ہے جن میں سے ہر حصہ تین تین بابوں پر مشمل ہے۔ اب تک کی گفتگو میں ہم نے پہلے حصے کے تمام بابوں پر اتنی مقدار میں ضرور روشنی ڈال دی ہے کہ مایرؔ کی زبان، انداز بیاں اور مواد کے تعلق سے ایک واضح نظریہ قائم کرنے میں ان شاء اللہ تعالی آپ کو کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ اب اگر پہلے حصے سے آگے بڑھ کر کتاب کے دوسرے حصے کی بات کی جائے تو بتا دیں کہ دوسرے حصے میں مایرؔ نے اسلام یا پیغمبر اسلام ﷺ کے تعلق سے براہ راست گفتگو نہیں کی ہے بلکہ اس حصے میں انہوں نے عہد نامہ

جدید اور قدیم کے تعلق سے ایک مختصر تعارف پیش کرنے کے بعد یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن حکیم کے اندر عیسائیت اور یہودیت کے تعلق سے کیا کچھ کہا گیا ہے؟ تفصیل یہ ہے کہ مایرؔ نے کتاب کا یہ دوسرا حصہ بھی پہلے حصے ہی کی طرح تین بابوں پر منقسم کیا ہے:

الف:

پہلے باب میں مایرؔ نے اپنی جانب سے سورتوں کی ایک تاریخی ترتیب قائم کر کے وہ آیتیں نقل کی ہیں جو مکی سورتوں میں شامل ہیں اور جن میں اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو "یا أھل الکتاب، الذین آتینٰھم الکتاب، الذین اوتوا الکتاب، أھل انجیل، أھل ذکر، الذین آتینٰھم نصیبا من الکتاب" جیسے جملوں کے ذریعے مخاطب کیا گیا ہے۔ میرے مطالعے کی حد تک ولیئم مایرؔ اس انتخاب اور نقل آرائی کے معاملے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں اور انہوں نے یہ کام یقینی طور پر کافی محنت اور لگن کے ساتھ انجام دیا ہے۔ یہ باب ص:۲۷/ سے لے کر ص:۱۳۴/ تک پھیلا ہوا ہے، اور سورتوں کی ترتیب یہ ہے:

(۱) سورۃ: الأعلی، (۲) سورۃ: النجم، (۳) سورۃ: عبس، (۴) سورۃ: السجدۃ، (۵) سورۃ: الزمر، (۶) سورۃ: القمر، (۷) سورۃ السبا، (۸) سورۃ: فصلت، (۹) سورۃ: الجاثیۃ، (۱۰) سورۃ: الصافات، (۱۱) سورۃ: الشعراء، (۱۲) سورۃ: الاحقاف، (۱۳) سورۃ: فاطر، (۱۴) سورۃ: مریم، (۱۵) سورۃ: الشوری، (۱۶) سورۃ: المؤمن، (۱۷) سورۃ: الفرقان، (۱۸) سورۃ: طہ، (۱۹) سورۃ: الزخرف، (۲۰) سورۃ: یوسف، (۲۱) سورۃ: ھود، (۲۲) سورۃ: یونس، (۲۳) سورۃ: الانعام، (۲۴) سورۃ: القصص، (۲۵) سورۃ: المؤمنون، (۲۶) سورۃ: الأنبیاء، (۲۷) سورۃ: الاسراء، (۲۸) سورۃ: النحل، (۲۹) سورۃ: الرعد، (۳۰) سورۃ: العنکبوت، (۳۱) سورۃ: الأعراف، (۳۲) سورۃ: المدثر۔

اس طرح مایرؔ نے اس پہلے باب میں اہل کتاب سے متعلق ترتیب وار متذکرہ بالا ۳۲/ سورتوں کے مختلف مقامات سے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، اور جا بجا مفاہیم کی وضاحت کے لئے بیضاوی اور جلالین وغیرہ جیسی کتب تفسیر کے حوالے سے کچھ آیتوں کی ہلکی پھلکی تفاسیر بھی بیان کی ہیں۔ اس باب کا عنوان ولیئم مایرؔ نے "Passages From Suras Revealed At Mecca" متعین کیا ہے۔

ب:

دوسرے باب میں مایرؔ نے اہل کتاب سے تعلق رکھنے والی وہ آیتیں نقل کی ہیں جو مدنی سورتوں میں شامل ہیں۔ یہ والا باب ص:۱۳۵/ سے لے کر ص:۲۱۶/ تک پھیلا ہوا ہے، اور اس باب میں ترتیب وار اِن سورتوں سے متعلقہ آیتیں نقل کی گئی ہیں:

(۱) سورۃ: البقرۃ، (۲) سورۃ: الحدید، (۳) سورۃ: البینۃ، (۴) سورۃ: الجمعۃ، (۵) سورۃ: الفتح، (۶) سورۃ: الصف، (۷) سورۃ: النساء، (۸) سورۃ: آل عمران، (۹) سورۃ: المائدۃ، (۱۰) سورۃ: التحریم، (۱۱) سورۃ: التوبۃ۔

اس طرح مایرؔ نے اس دوسرے باب میں اہل کتاب سے متعلق ترتیب وار متذکرہ بالا ۱۱/ سورتوں کے مختلف مقامات سے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، اور اس باب کا عنوان انہوں نے "Passages From Suras Revealed At Medina" متعین کیا ہے۔

دوسرے حصے کا تیسرا باب دراصل کتاب کا "خاتمہ" ہے جو ص:۲۱۶/ سے لے کر ص:۲۳۷/ تک پھیلا ہوا ہے۔

اس خاتمہ کے اندر ولیئم مایرؔ نے مختلف عناوین کے تحت چند چھوٹی چھوٹی بحثیں رقم کی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

"عہد نبوی میں عہد نامہ قدیم اور جدید کی موجودگی اور وقعت"، "یہودی اور عیسائی صحائف کے تئیں قرآنی تصدیقات"، "قرآن حکیم کے اندر یہودی اور عیسائی صحائف کی تعریف" اور "یہودیوں کے خلاف الزامات" وغیرہ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کتاب کا پہلا حصہ دوسرے حصے کی بنسبت واضح عصبیت اور اسلام دشمنی پر مبنی ہے تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ دوسرے حصے کی تمام عبارتوں کو ہم وحی الٰہی کی طرح کی "آمنا وصدقنا" کہہ کر قبول کر لیں۔ بے شک یہ والا حصہ قابل مطالعہ ہے مگر کھلی آنکھوں کے ساتھ۔

حوالہ جات:

1--William Muir, (The Coran: Its Composition And Teaching. Page:8

۲- سورۃ: الروم، الآیۃ: ۵۸، الجزء: ۲۱۔

۳- سورۃ: القمر، الآیۃ: ۱۵، الجزء: ۲۳۔

۴-سورۃ: یونس، الآیۃ: ۲۴، الجزء: ۱۱۔

۵-سورۃ: ص، الآیۃ: ۲۹، الجزء: ۲۳۔

۶- سورۃ: الدخان، الآیۃ: ۵۸، الجزء: ۲۵۔

۷-سورۃ: محمد، الآیۃ: ۲۴، الجزء: ۲۶۔

۸-سیوطی، جلال الدین ابوالفضل عبدالرحمن بن ابو بکر بن محمد بن ابو بکر بن عثمان۔ الاتقان فی علوم القرآن، ص: ۳۴۔ مطبوعہ: مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، لبنان۔ سن اشاعت: ۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء۔

۹-کرمانی، ابوالقاسم برہان الدین محمود بن حمزہ بن نصر۔ أسرار التکرار فی القرآن المسمی البرھان فی توجیہ متشابہ القرآن لما فیہ من الحجۃ والبیان۔ ص: ۶۸۔ مطبوعہ: دار الفضیلۃ، قاہرہ، مصر۔ سن اشاعت: ندارد۔

۱۰-قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح انصاری اندلسی مالکی(متوفی: ۶۷۱ھ/ ۱۲۷۳ء)۔ الجامع لاحکام القرآن ،ج:۱، ص:۹۸۔ مطبوعہ: مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت ، لبنان۔ سن اشاعت: ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء ۔

۱۱- سیوطی، جلال الدین ابوالفضل عبدالرحمن بن ابو بکر بن محمد بن ابو بکر بن عثمان۔ أسرار ترتیب القرآن۔ ص:۴۳۔مطبوعہ: دار الفضیلۃ، قاہرہ، مصر۔ سن اشاعت: ندارد۔

۱۲-سیوطی، جلال الدین ابوالفضل عبدالرحمن بن ابو بکر بن محمد بن ابو بکر بن عثمان۔ أسرار ترتیب القرآن۔ ص:۴۴۔مطبوعہ: دار الفضیلۃ، قاہرہ، مصر۔ سن اشاعت: ندارد۔

۱۳- قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح انصاری اندلسی مالکی۔ الجامع لاحکام القرآن ،ج:۱، ص:۱۰۰۔ مطبوعہ: مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، لبنان۔ سن اشاعت: ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء ۔

۱۴-سیوطی، جلال الدین ابوالفضل عبدالرحمن بن ابو بکر بن محمد بن ابو بکر بن عثمان۔ أسرار ترتیب القرآن۔ ص:۴۵۔مطبوعہ: دار الفضیلۃ، قاہرہ، مصر۔ سن اشاعت: ندارد۔

۱۵-(Page:۱۳)

۱۶- سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۲۴،۲۳، الجزء: ۱۔

۱۷-سورۃ: الغاشیۃ، الآیۃ: ۱۹، الجزء:۲۹۔

۱۸-سورۃ :الانبیاء ، الآیۃ: ۳۱، الجزء:۱۷۔

۱۹-سورۃ: النباء ، الآیۃ: ۷، الجزء:۳۰۔

۲۰-سورۃ :الانعام ، الآیۃ: ۱۲۵، الجزء: ۸۔

۲۱- تھامس کارلائل۔ آن ہیروز، ہیرو ورشپ...، مطبوعہ:ییل یونیورسٹی پریس، نیو ہیون اینڈ لندن؛ص: ۵۲۔

۲۲-سورۃ: الطور، الآیۃ: ۳۴،۳۳، الجزء:۲۷۔

۲۳-سورۃ: ھود، الآیۃ: ۱۳، ۱۴، الجزء: ۱۲۔

۲۴-(Page:۱۵,۱۶)

۲۵-سورۃ: الفرقان، الآیۃ: ۶:۵:۴، الجزء:۱۸۔

۲۶-سورۃ: الانفال، الآیۃ: ۳۱، الجزء: ۹۔

۲۷-(Page:۴۰)

۲۸-سورۃ البقرۃ، ۷۔

۲۹-(Page:۴۰)

۳۰-(Page:۴۰)

۳۱- حاکم، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمد بن حمدویہ بن نعیم بن الحکم نیشاپوری شافعی۔المستدرک علی الصحیحین ،ج:۵، ص:۱۱۳۰۔ مطبوعہ: دار التاصیل، قاہرہ، مصر۔ سن اشاعت: ۱۴۳۵ھ / ۲۰۱۴ء۔

۳۲-حاکم، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمد بن حمدویہ بن نعیم بن الحکم نیشاپوری شافعی۔المستدرک علی الصحیحین ،ج:۵، ص:۱۱۳۰۔ مطبوعہ: دار التاصیل، قاہرہ، مصر۔ سن اشاعت: ۱۴۳۵ھ / ۲۰۱۴ء۔

۳۳- سیوطی، جلال الدین ابوالفضل عبدالرحمن بن ابو بکر بن محمد بن ابو بکر بن عثمان۔ الاتقان فی علوم القرآن، النوع الثامن عشر: فی جمعہ و ترتیبہ۔ ص: ۱۲۹۔ مطبوعہ: مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، لبنان۔ سن اشاعت: ۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء۔

۳۴-(Page:۴۳)

اسناد بخاری میں راویوں کی معرفت کے طریقے

"القواعد المفیدۃ فی معرفۃ اسماء الرجال المذکورین فی جامع الامام البخاری"

ابوالابدال محمد رضوان طاہر فریدی، اوکاڑا

Abstract:

Sahih Bukhari is one of the most followed and referred works in Islam after the Holy Quran. It has been subject to research since its compilation by Imam Bukhari. Many works have been dedicated to its introduction, explanation and annotation by great Hadith scholars over a period of time. Specific works have also been written on the Hadith narrators of Sahih Bukhari to enable scholars to have glimpse of the lives and credibility of its narrators, and their standing in the field of 'Ilm ul-Isnad' (the Science of Hadith Transmission) and its principles. The narrators of the Hadiths collected in Sahih Bukhari are numerous and many share same names and teachers which confuses the reader. Moreover, there are hundreds of chains of transmission that are sometimes intriguing even to the most well-read scholar of Sahih Bukhari. Therefore, there is very high chance that there might be confusion and misunderstanding in knowing the mediums of such Hadith transmissions. This particular article will shed light on the principles of identifying over 70 such narrators, their routes of transmission and who narrates from whom based on their unique names, special characteristic features evolving around their lives and eras as well as historical intra student-teacher relationships as mentioned by Hadith masters in their valuable works on the subject.

Key Words:

Hadith, Hadith Studies, Sihah Sittah, Six Canonical Hadith Works, Imam Bukhari, "Isnad" Studies, Chains of Hadith Transmission and Narration, Narrator Studies.

امیر المومنین فی الحدیث امام محمد بن اسماعیل بخاری:

ملت اسلامیہ میں بڑے بڑے جلیل القدر محدثین ہوئے ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی حفاظت اور نشر و اشاعت میں اپنی زندگیاں وقف کیں اور اس فن میں عظیم مناصب پر فائز ہوئے مگر اپنے زمانے سے لے کر آج تک جو مقام امیر المومنین امام محمد بن اسماعیل بخاری کے

حصے میں آیا ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔علم حدیث میں آپ کا آفتاب ان شاء اللہ قیامت تک جگمگاتا رہے گا، اور آپ کی تصانیف بالخصوص "الجامع الصحیح" سے علما، محدثین، فقہاو صوفیہ اور ہر طبقہ کے لوگ استفادہ کرتے رہیں گے۔ "الجامع الصحیح" کے زمانہ تدوین کے بعد سے لے کر عصر حاضر تک ہر دور کے اہل علم نے اسے اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس پر مختلف جہات سے کام کیا ہے جس کا مختصر جائزہ ہم آنے والے صفحات میں لیں گے۔ البتہ اس سے پہلے "الجامع الصحیح" کے مصنف امام محمد بن اسماعیل بخاری کی سیرت و شخصیت پر مختصر روشنی ڈال دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نام ونسب:

امام بخاری کا نام "محمد" جبکہ کنیت "ابو عبداللہ" ہے ، والد کا نام "اسماعیل" اور بخارا شہر کی طرف نسبت کی وجہ سے "بخاری" کہلاتے ہیں۔القابات میں امام المحدثین، امیر المومنین فی الحدیث اور زین الامت شامل ہیں۔سلسلہ نسب اس طرح ہے: محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ الجعفی البخاری۔[۱]

ولادت:

امام بخاری کی ولادت نماز جمعہ کے بعد ۱۳ شوال ۱۹۴ھ کو اسماعیل بن ابراہیم کے گھر ہوئی۔[۲] آپ کے والد ماجد بھی طبقہ رابعہ کے محدث اور اہل تقوی میں سے تھے؛ اور وہ امام مالک، عبداللہ بن مبارک اور حماد بن زید جیسے محدثین کے تلامذہ میں شامل ہوتے ہیں۔[۳] امام بخاری نے "تاریخ کبیر" اور محدث ابن حبان نے "الثقات" میں ان کے حالات قلم بند کیے ہیں۔

تحصیل علم:

امام بخاری نے بچپن میں جب ابتدائی تعلیم مکمل کر لی تو دس سال کی عمر میں آپ کے دل میں حفظ حدیث کا شوق پیدا ہوا۔ خود فرماتے ہیں:

"الهمت حفظ الحديث، وأنا في الكتاب، قال و كم أتى عليك اذذاك؟ فقال: عشر سنين أو أقل"

یعنی:

اُس وقت میرے دل میں حفظ حدیث کا شوق پیدا ہوا جب میں ابھی مکتب میں تھا۔ سوال ہوا کہ اس وقت آپ کی عمر کتنی تھی؟ فرمایا: دس سال یا اس سے بھی کم۔

اور فقط ایک سال میں ہی آپ نے حفظ حدیث اور اسناد پر اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ اپنے اساتذہ کی غلطیوں کی تصحیح کرنے لگے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں یہ واقعہ کافی مشہور ہے کہ آپ کے ایک استاد داخلی نے حدیث بیان کرتے ہوئے اس طرح سند پڑھی:

"سفيان عن أبي الزبير عن ابراهيم"

اس پر آپ نے فوراً فرمایا: ابی زبیر کی ابراہیم سے کوئی روایت نہیں ہے جس پر ان کے استاد نے انہیں تہدید کی، آپ نے استاد سے فرمایا: آپ کے پاس اصل ہے تو اس میں دیکھ لیجیے، جب انہوں نے اصل ملاحظہ کیا تو واقعی ابی زبیر کی ابراہیم سے روایت نہیں تھی۔ پھر استاد نے پوچھا: درست کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "زبير بن عدي عن ابراهيم"

اس کے بعد محدث داخلی نے اپنی غلطی کو درست کیا اور فرمانے لگے اے لڑکے! تم نے سچ کہا ہے۔[۴]

امام بخاری نے ۱۶ سال کی عمر میں حضرت عبداللہ بن مبارک اور امام وکیع کی کتب حفظ کر لی تھیں اور صرف اٹھارہ برس کی عمر میں "تاریخ الکبیر" اور صحابہ وتابعین کے قضایا و اقوال پر دو شاندار کتب تصنیف کر چکے تھے۔[۵]

علمی اسفار:

امام بخاری نے طلب حدیث کے لیے دور دراز کے علاقوں کا سفر بھی کیا اور کئی کئی سال تک اپنے وطن سے باہر رہے۔ مؤرخین نے جن علاقوں کی طرف آپ کے اسفار کی تفصیل دی ہے ان میں حجاز مقدس، بغداد، کوفہ، بصرہ، خراسان، یمن، شام اور مصر شامل ہیں۔

زہد وتقوی:

امام بخاری زہد و تقوی کے اس منصب پر فائز تھے جس پر ایک نائب رسول ﷺ کو ہونا چاہیے، چنانچہ ایک مرتبہ امام صاحب کے پاس ان کا کچھ مال تجارت پہنچا اور عشاء کے وقت بعض تاجروں نے اسے پانچ ہزار درہم میں خریدنے کی رغبت ظاہر کی۔ امام صاحب نے کسی بھی طرح کا معاملہ طے کیے بغیر انہیں واپس بھیج دیا البتہ اِن تاجروں کو وہ مال دینے کی رغبت پیدا ہو چکی تھی، اگلے دن صبح تاجروں کی ایک دوسری جماعت ملی اور انہوں نے آپ کو

اس مال کے دس ہزار درہم دینے چاہے، آپ نے انہیں یہ کہتے ہوئے مال نہ دیا اور واپس بھیج دیا کہ:

میں نے رات آنے والے تاجروں کو مال بیچنے کی نیت کر لی تھی تو اب میں اپنی نیت توڑنا نہیں چاہتا (اور انہیں پانچ ہزار درہم میں ہی مال دے دوں گا)۔[٦]

اور اسی تقوی و پرہیزگاری کا ہی نتیجہ تھا کہ آپ اپنی ضروریات زندگی کی اشیاء بھی خود نہیں خریدتے تھے بلکہ اس کے لیے کسی دوسرے شخص کو متعین کر رکھا تھا۔[٧]

علم کی عزت:

امام بخاری بڑے خوددار تھے، علم و علما کے مقام و مرتبے سے خوب واقف تھے، زندگی بھر امرا سے دور رہے اور علم کو حاکموں کے درباروں میں لے جا کر ذلیل نہیں ہونے دیا۔ امیر بخارا نے جب آپ کی شہرت سنی تو خالد بن احمد ذھلی کے ذریعہ پیغام بھجوایا کہ: امام بخاری دربار میں حاضر ہوں تا کہ وہ "الجامع الصحیح" اور تاریخ کا سماع کریں مگر آپ نے جانے سے صاف انکار کر دیا اور قاصد کو کہا: امیر بخارا سے کہنا کہ میں علم کو ذلیل نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی اسے حاکموں کے درباروں میں لے کر جاؤں گا، اگر انہیں ضرورت ہے تو میری مسجد تشریف لے آئیں یا میرے گھر آجائیں۔[٨]

وفات:

امام بخاری نے ۱۳ دن کم باسٹھ سال کی عمر پا کر یکم شوال یعنی عید الفطر کی رات عشاء کے وقت ۲۵۶ھ میں وصال فرمایا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔[٩]

تصانیف:

امام بخاری نے اپنے پیچھے جو تصانیف چھوڑی ہیں ان میں سے پچیس کتب کے اسماے مؤرخین نے گنوائے ہیں جن میں "الجامع الصحیح، التاریخ الکبیر، الادب المفرد، المسند الکبیر، کتاب العلل اور رفع الیدین فی الصلوۃ" شامل ہیں۔

الجامع الصحیح کا مکمل نام:

امام بخاری کی "الجامع الصحیح" جو عرف عام میں بخاری شریف کے نام سے معروف ہے اس کا مکمل اور صحیح نام یہ ہے "الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ ﷺ وسننہ و ایامہ۔"[١٠]

الجامع الصحیح کا مقام:

امام بخاری کی کتابوں میں جو شہرت و مقبولیت "الجامع الصحیح" کو حاصل ہوئی ہے وہ ان کی کسی دوسری کتاب کو نہیں ملی بلکہ کتب حدیث میں جو مقام اسے ملا ہے وہ کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آیا، یہاں تک کہ علما نے اس کے متعلق "اصح بعد کتاب اللہ" کا قول کیا ہے، اور یہ کتاب ایسی بابرکت ہے کہ اس کا پڑھنا بیماریوں سے شفا اور اس کے مطالعے سے ہر قسم کے حزن و ملال کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔[١١]

علما فرماتے ہیں:

دشمن کے خوف، سخت مصیبت، قحط سالی اور دیگر بلاؤں سے حفاظت کے لیے نیز اپنی مرادوں اور مقاصد کے پورا ہونے میں اس کا پڑھنا تریاق کا کام دیتا ہے اور یہ تجربہ شدہ بات ہے۔[١٢] فاتح بیت المقدس صلاح الدین ایوبی نے صلیبی جنگوں کے دوران اس کتاب کا ختم کروایا تھا اور بعض اصحاب تقوی کے خواب میں رسول اللہ ﷺ نے اس کتاب کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔[١٣]

بخاری شریف پر ہونے والا کام، ایک مختصر جائزہ:

بخاری شریف اپنے زمانہ تصنیف سے لے کر اب تک علما و محدثین کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے اور امت مسلمہ نے اسے حرز جاں بنایا ہوا ہے۔ ملت اسلامیہ کا ایسا کوئی علاقہ یا خطہ نہیں جہاں اس کے دروس کا اہتمام نہ کیا گیا ہو۔

بخاری شریف کے تراجم:

علما و محققین نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس پر مختلف انداز میں کام کیا ہے۔ کسی نے اسے ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا، اور آج یہ عالم ہے کہ دنیا کی شاید ہی کوئی بڑی زبان ہو جس میں اس کے تراجم نہ ہو چکے ہوں۔ جن زبانوں میں اس کے تراجم دستیاب ہیں ان میں فارسی، اردو، پشتو، سندھی، گجراتی، ہندی، بنگالی، انگریزی، جرمن اور فرانسیسی وغیرہ شامل ہیں بلکہ ایک ایک زبان میں متعدد تراجم ملتے ہیں۔

بخاری شریف کی شروحات:

بعض خوش نصیبوں نے اس میں موجود احادیث کی شرح لکھنے کی طرف توجہ مبذول کی اور ایسی ایسی بے مثال ولازوال شروحات سپرد قلم کیں کہ قیامت تک علما ان سے خوشہ چینی کرتے رہیں گے۔

ان شروحات میں"اِعلام السنن، شرح ابن بطال، الکواکب الدراری، فتح الباری اور عمدۃ القاری"بہت نمایاں ہیں۔ اردو میں بھی کئی شروحات سامنے آچکی ہیں جن میں فقیہ اعظم ہند علامہ شریف الحق امجدی کی "نزہۃ القاری"اور شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی کی "نعمۃ الباری"کو مقبولیت عامہ حاصل ہوئی ہے۔ اول الذکر متوسط اور ثانی الذکر مطول ہے، جب کہ محدث صغیر علامہ محمود احمد رضوی کی"فیوض الباری"بھی عمدہ کاوش ہے۔

بخاری شریف کے تراجم ابواب پر کام:

کوئی وہ ہیں جنہوں نے تراجم ابواب کو حل کرنے کی کامیاب کوششیں کیں اور اس پر مستقل کتب تصنیف کیں، جیسے علامہ ناصر الدین احمد بن المنیر خطیب اسکندریہ نے "المتواری علی تراجم البخاری"کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی، علامہ محمد بن منصور المغربی نے "فک اغراض البخاری المبھمہ فی الجامع بین الحدیث والترجمہ"کے نام سے کتاب تصنیف کی، علامہ ابن ابی عبداللہ رشید السبتی نے "ترجمان التراجم"کے نام سے مبسوط کتاب لکھی۔[۱۴]ہند کے فاضل شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی اس موضوع پر ایک قیمتی رسالہ سپرد قلم کیا ہے۔

رجال بخاری پر کام:

بخاری شریف پر کام کرنے والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس کی اسناد میں موجود راویوں کو موضوع سخن بنایا اور پھر ان میں سے بھی بعض نے فقط اسماء کو جمع کیا، بعض نے ان کی تاریخ ولادت و وفات کو جمع کیا، کچھ نے ان کی شخصیت کے متعلق دیگر معلومات بھی عطا کیں اور بعض وہ ہیں جنہوں نے تعدیل و تجریح کی جہت سے ان پر کلام کیا۔ اگر دیکھا جائے تو امت مسلمہ میں صرف بخاری پر کام کرنے والوں کا ایک پورا مکتب تیار ہو گیا ہے۔

رجال بخاری پر جو کتب اب تک لکھی گئی ہیں ان میں اکثر عربی میں ہیں جن میں سے بعض کے اسماء مع مؤلفین درج ذیل ہیں:

۱-"اسامی من روی عنھم البخاری":عبداللہ بن عدی بن عبداللہ الجرجانی بن قطعان(م:۳۶۵ھ)

۲-"ذکر اسماء التابعین و من بعدھم ممن صحت روایتہ من الثقات عند محمد بن اسماعیل البخاری":ابی الحسن علی بن عمر الدارقطنی(م:۳۸۵ھ)

۳-"اسماء رجال صحیح البخاری":ابی نصر احمد بن محمد بن الحسین الکلاباذی(م:۳۹۸ھ)

۴-"التعدیل والتجریح لمن خرج عنہ البخاری فی الجامع الصحیح":ابی الولید سلیمان بن خلف الباجی(م:۴۷۴ھ)

۵-"احادیث التعلیق":علامہ ابو الفرج عبدالرحمن بن ابی الحسن بن الجوزی(م:۵۹۷ھ)۔یہ کتاب ان احادیث کے راویوں کے اثبات پر ہے جن کو امام بخاری نے اسناد کے بغیر ذکر کیا ہے۔

۶-"اسامی شیوخ البخاری":ابی الفضائل الحسن بن محمد بن الحسن الصاغانی(م:۶۵۰ھ)

۷-"المجتبی فی معرفۃ اسماء من ذکرھم البخاری بالانساب والالقاب والکنی":محمد بن احمد بن موسی بن عبداللہ العجلونی(م:۸۳۱ھ)

۸-"تغلیق التعلیق علی کتاب البخاری":الحافظ احمد ابن حجر العسقلانی(م:۸۵۲ھ)

۹-"غایۃ المرام فی رجال البخاری الی سید الانام":محمد بن داؤد بن محمد البازلی(م:۹۲۵ھ)

۱۰-"صحیح البخاری و اسانیدہ":ابی محمد عبداللہ بن سالم البصری(م:۱۱۳۴ھ)

۱۱-"رجال صحیح البخاری":عبدالرحمن بن ابی الخیر التستری النصربونی۔

۱۲-"اسامی رواۃ صحیح البخاری": حسن بن حسن صوفی زادہ(م:۱۲۷۹ھ)

۱۳-"عقد الجمان الامع المنقی من قعر البحر الجامع": محمد بن علی القوجیلی۔

ماخذ بخاری:

تاریخ اسلام میں بخاری شریف پر ایک بڑا انوکھا اور دلچسپ کام جو ماضی قریب میں ہوا ہے وہ ڈاکٹر فواد سیزگین کا ہے۔ آپ نے بخاری شریف کا مطالعہ اس جہت سے کیا کہ امام بخاری نے"الجامع الصحیح"کی تصنیف میں اپنے سے پہلے لکھی گئی دیگر کتب وصحائف سے بھی مواد نقل کیا ہے یا اس کی تمام روایات صرف زبانی رہی ہیں جیسا کہ مشہور ہے ؟

ڈاکٹر فواد سیزگین نے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۴ء تک کم و بیش دو سال اس موضوع پر مطالعہ و تحقیق میں صرف کیے اور بخاری شریف کے ماخذ پر ایک منفرد مقالہ قلم بند کیا۔ عام رجحان کے خلاف انہوں نے اپنے اس مقالے میں یہ ثابت کیا کہ امام بخاری نے اپنی صحیح کی تدوین کے وقت اپنے سے قبل تحریر شدہ مجموعات احادیث کو بھی پیش نظر رکھا تھا۔

ڈاکٹر فواد سیزگین کا یہ مقالہ اس جہت سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے تدوین حدیث پر مستشرقین کے پھیلائے ہوئے اس پروپگنڈے کا خاتمہ ہوجاتا ہے کہ ذخیرہ حدیث تین صدیوں کے بعد سامنے آیا اور یہ ممکن نہیں ہے کہ روایات سینوں میں محفوظ رہی ہوں بلکہ تین صدیوں بعد محدثین نے انہیں وضع کرکے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

ویسے تو مستشرقین کا یہ اعتراض انتہائی سطحی قسم کا ہے جو تاریخ اسلام اور تاریخ تدوین حدیث سے عدم واقفیت پر دال ہے اور ساتھ ہی عقلی و نقلی دلائل بھی اس کو قبول کرنے سے قاصر ہیں۔ ڈاکٹر فواد سیزگین کی اس تحقیق نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ "امھات کتب الحدیث" اور پھر ان میں بھی بخاری شریف کو امام بخاری نے تصنیف کرتے وقت صحیح احادیث کی چھان بین میں صرف اپنے حافظے پر ہی اعتماد نہیں کیا بلکہ حدیث پر لکھے ہوئے اپنے سے پہلے مجموعہ جات اور صحائف سے بھی استفادہ کیا ہے یا ان کو مد نظر رکھا ہے۔

اسناد پر منفرد کام:

بخاری شریف پر مزید کلام کرنے کی بجائے اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ بخاری شریف پر جو مختلف انداز میں کام ہوئے ہیں ان میں زیر نظر کام بھی منفرد اور اہمیت کا حامل ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق تاریخ حدیث میں "الجامع الصحیح" پر اس طرح کی کوئی بھی کتاب یا رسالہ سامنے نہیں آیا جس کے اندر بخاری شریف کی اسناد میں موجود ایسے راویوں کی تعین میں قواعد جمع کیے گے ہوں جن کو پیش نظر رکھ کر ہم بآسانی کسی ایسے راوی کا تعین کر سکیں جس کی معرفت شروحات اور رجال بخاری پر لکھی گئی کتب کی طرف رجوع کیے بغیر ناممکن ہو۔ اس طرح زیر نظر رسالہ تادم تحریر اپنے موضوع کی پہلی اور آخری کاوش ہے جس کی اہمیت کا اندازہ مدارس سے وابستہ طلبا و علما ان قواعد کو پڑھنے کے بعد بخوبی لگالیں گے، اس لیے بخاری شریف کا درس لینے والے طلبا سے میں کہوں گا کہ وہ ان قواعد کو حفظ کرلیں یا کم از کم انہیں اپنے مطالعے میں ضرور رکھیں۔

"القواعد المفیدۃ" سے متعلق ابتدائی باتیں:

آگے بڑھنے سے قبل "القواعد المفیدۃ" کے متعلق کچھ تمہیدی باتیں ذہن نشین کر لینا بہتر ہے۔

بخاری شریف اور دیگر کتب حدیث پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ ان کتب کی اسناد میں بعض اوقات کسی راوی کا نام، کنیت یا فقط نسب مذکور ہوتا ہے اور ایک ہی نام، کنیت یا علاقائی نسبت ہونے کی وجہ سے راویوں کے درمیان اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے جس کو حل کرنے کے لیے شروحات اور کتب رجال کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور یہ کام کافی صبر آزما اور سخت محنت کا متقاضی ہے۔

ایسی ہی صورت حال بخاری شریف کی قراءت میں بھی پائی جاتی ہے کیوں کہ ہمارے ہاں مدارس اسلامیہ میں بخاری شریف کے دروس کا اہتمام کثرت سے کیا جاتا ہے اس لیے سب سے زیادہ قراءت و تدریس بھی اسی کتاب کی ہوتی ہے۔ اساتذہ تو اسباق پڑھانے کے لیے محنت کرتے ہی ہیں البتہ بعض طلبا بھی نہ صرف لائق ہوتے ہیں بلکہ بہت محنتی بھی ہوتے ہیں۔ ایسے طلبا جب اسباق تیار کرتے ہیں تو انہیں اکثر اسناد میں مذکور راویوں کے فقط مختصر نام، کنیت یا نسبت و نسب کی وجہ سے مشکل پیش آتی ہے کہ وہاں کون سی شخصیت مذکور ہے؟ اسی مشکل کو حل کرنے کے لیے زیر نظر مقالے میں ایسے قواعد بیان کئے گئے ہیں جنہیں یاد کرنے سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا کہ زیر نظر شخصیت کون سی ہے؟

رجال بخاری پر اب تک جتنا بھی کام ہوا ہے یہ ان میں منفرد اور حیرت انگیز ہونے کے ساتھ انتہائی مختصر بھی ہے۔ اس موضوع پر وہی شخص خامہ فرسائی کر سکتا تھا جو سالہا سال بخاری شریف کی تدریس میں مشغول رہا ہو۔ یہ وہ قواعد ہیں جنہیں رجال بخاری پر مہارت رکھنے والے محدثین سینہ بہ سینہ ہی بیان کرتے رہے ہیں اور کبھی کسی نے انہیں ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔

یہ رسالہ دراصل فہد بن علی الکشی کا تالیف کردہ ہے جس میں انہوں نے خاص بخاری شریف کے رجال کے اسماء وغیرہ کو حل کرنے کے لیے مفید قواعد جمع کر دیئے ہیں۔ ان قواعد کو انہوں نے اپنے استاد شیخ محمد بن عبداللہ الصومالی کے دروس کے دوران جمع کیا تھا جو شیخ کے کم و بیش چالیس سالہ تدریس و مطالعہ کا نچوڑ ہیں، اور جمع کرنے کے بعد اپنے استاد کی بارگاہ میں قراءت بھی کی تھی۔ اس دوران ان سے جہاں غلطی واقع ہوئی اور اصلاح کی ضرورت تھی، شیخ نے وہ کروادی تھی؛ جس کے بعد انہوں نے "القواعد المفیدۃ فی معرفۃ اسماء الرجال المذکورین فی جامع الامام البخاری" کے نام سے ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۲ء میں ان قواعد کو مکتبہ ابن تیمیہ، قاہرہ سے ۱۷ صفحات پر مشتمل پبلش کروایا۔

مؤلف کے حالات تک رسائی نہیں ہو سکی البتہ ان کے شیخ محمد بن عبد اللہ الصومالی کی ولادت ۱۹۰۰ء کے بعد صومال میں ہوئی تھی۔ سلسلہ نسب حضرت عقیل بن ابی طالب تک منتہی ہوتا ہے۔ آباؤ اجداد امام شافعی کے مقلد تھے۔ سات یا آٹھ سال کی عمر میں طلب علم مشغول ہوئے، سب سے پہلے حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی، پھر یمن کے مختلف شیوخ سے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی اور بلوغ المرام کو حفظ کیا۔ اس کے بعد ۱۳۶۰ھ میں مکہ مکرمہ کی طرف سفر کیا اور وہاں کے ایک مدرسہ دار الحدیث میں علم حدیث کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ فراغت کے بعد اسی مدرسہ کے اندر درس حدیث میں مشغول رہے، آخری عمر میں ضعف اور بیماری کے سبب اپنے گھر میں یہ سلسلہ جاری رکھا۔ شیخ کو علم حدیث میں اچھی مہارت تھی، خاص کر علم اسماء الرجال پر خصوصی نظر رکھتے تھے۔ تاریخ وفات ۳ رمضان ۱۴۲۰ھ ہے۔[۱۵]

اب سے تقریباً چار سال قبل یہ رسالہ (القواعد المفیدہ) راقم الحروف کے مطالعے میں آیا تھا تو اسی وقت ان مفید قواعد کو اردو میں منتقل کرنے کا ذہن بنالیا تھا مگر تعلیمی مصروفیات کے باعث اس طرف متوجہ نہیں ہو سکا اور پھر بات ذہن سے بھی نکل گئی۔ آج سے چار دن قبل اچانک یہ رسالہ یاد آیا تو باقی تمام کام موقوف کر کے اس پر کام شروع کر دیا۔

کام کا طریقہ کار:

- رسالے کے شروع میں مؤلف کا تین صفحات کا ابتدائیہ اور ایک صفحہ پر کسی صاحب علم کے تاثرات تھے اور آخر میں ایک صفحہ پر کلمات تشکر، ان صفحات کا ترجمہ کرنا ہم نے ضروری نہیں سمجھا کیوں کہ اس کی حاجت نہیں تھی، صرف قواعد پر ہی توجہ مرکوز رکھی ہے البتہ ابتدائیے کی معلومات کی تلخیص مذکورہ بالا سطور میں بیان کر دی ہے۔
- عربی عبارات کے ساتھ ترجمہ کی مراجعت و نظر ثانی کا مکمل کام مولانا محمد سلمان رضا عطاری المدنی (مدرس: جامعۃ المدینہ، زیارت معصوم، ضلع ایبٹ آباد) نے سر انجام دیا ہے۔
- ان قواعد کو اردو میں منتقل کرتے وقت بعض راویوں کے اسماء کے تعین، جہاں ضرورت محسوس ہوئی، تحقیق و اطمینان کے لیے کتب اسماء الرجال سے اُن کے حالات دیکھ کر تسلی کر لی ہے۔
- ترجمہ کے دوران اگر کہیں کوئی اضافی کلمہ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اسے اس () بریکٹ میں رکھا ہے۔

مؤلف نے ان قواعد کو جس ترتیب پر جمع کیا تھا ہم نے اسے برقرار رکھا ہے البتہ آسانی کے لیے مختلف مقامات پر مناسب ہیڈنگ کا اضافہ کر دیا ہے۔

- شروع میں امام بخاری کے مختصر حالات لکھ دیئے ہیں۔
- بخاری شریف پر مختلف انداز میں ہونے والے کام کا اشارتاً انتہائی مختصر جائزہ بھی پیش کیا ہے۔
- حواشی اور ماخذ و مراجع کی فہرست آخر میں دے دی ہے۔

"القواعد المفیدۃ فی معرفۃ اسماء الرجال المذکورین فی جامع الامام البخاری"

اسناد میں سفیان بن عیینہ کی پہچان کا طریقہ:

۱۔ حمیدی عبد اللہ بن الزبیر جب عن سفیان روایت کریں

تو سفیان سے مراد سفیان بن عیینہ ہیں کیوں کہ وہ ان سے روایت کرنے میں خاص ہیں۔

۲۔ علی بن عبد اللہ المدینی جب عن سفیان روایت کریں

تو سفیان سے سفیان بن عیینہ مراد ہوں گے۔

۳۔ قتیبہ بن سعید الثقفی ابو رجاء البغلانی جب عن سفیان روایت کریں

تو اس سے سفیان بن عیینہ مراد ہیں۔

۴۔ محمد بن سلام البیکندی جب عن سفیان روایت کریں

تو یہاں بھی سفیان سے سفیان بن عیینہ ہی مراد ہوں گے۔

۵۔ مسدد بن مسرھد البصری جب عن سفیان روایت کریں

تو اس جگہ بھی سفیان بن عیینہ ہی مراد ہیں۔

۶۔ ابو نعیم الفضل بن دکین سفیان نام کے دو بزرگوں سے روایت کرتے ہیں

اول: سفیان بن عیینہ، دوم: سفیان الثوری

جب وہ ابن عیینہ سے روایت کرتے ہیں تو اس کی صراحت اس طرح کر دیتے ہیں: حدثنا ابن عیینہ، اور جب سفیان ثوری سے روایت کرتے ہیں تو فرماتے ہیں: حدثنا سفیان۔اس طریقے میں کوئی اشتباہ نہیں ہے۔

اسناد میں سفیان الثوری کی پہچان کا طریقہ:

۷۔ قبیصہ بن عقبۃ الکوفی جب عن سفیان روایت کریں

تو اس سے امام سفیان بن سعید الثوری مراد ہوتے ہیں۔

۸۔ محمد بن کثیر العبدی جب عن سفیان روایت کریں

تو اس سے مراد امام سفیان بن سعید الثوری ہیں۔

۹۔ محمد بن یوسف الفریابی جب عن سفیان روایت کریں

تو یہاں بھی سفیان سے مراد امام سفیان بن سعید الثوری ہی ہیں۔

۱۰۔ وکیع بن جراح جب عن سفیان روایت کریں

تو یہ امام سفیان بن سعید الثوری ہوں گے۔

۱۱۔ عبداللہ بن مبارک المروزی جب عن سفیان روایت کریں

تو یہاں امام سفیان بن سعید الثوری مراد ہیں۔

۱۲۔ عبدالرحمن بن مھدی جب عن سفیان روایت کریں

تو سفیان سے امام سفیان بن سعید الثوری سمجھے جائیں گے۔

۱۳۔ سفیان الثوری جب عن صالح روایت کریں

تو اس سے بعض اوقات ابن حی مراد ہوں گے جب کہ بعض دفعہ کوئی اور۔

۱۴۔ خلاد بن یحیٰ جب عن سفیان روایت کریں

تو سفیان سے امام سفیان بن سعید الثوری مراد ہیں۔

اسناد میں عمرو نام کے راوی کی پہچان کا طریقہ:

۱۵۔ سفیان بن عیینہ جب عن عمرو روایت کریں

تو وہ عمرو بن دینار مکی ہوں گے کیوں کہ وہ دونوں مکی ہیں اور اسی طرح جب سفیان عن الزھری روایت کریں تو یہاں سفیان سے مراد مطلقاً سفیان بن عیینہ ہیں۔

۱۶۔ سفیان بن سعید الثوری جب عن عمرو روایت کریں

تو اکثر طور پر وہ عمرو بن عامر ہوں گے کیوں کہ کبھی کبھار وہ عمرو بن دینار سے بھی روایت کرتے ہیں۔

۱۷۔ شعبۃ بن حجاج الواسطی، البصری ابو سطام جب عن عمرو روایت کریں

تو اس سے ابن مرۃ مراد ہیں۔

۱۸۔ الاعمش سلیمان بن مھران جب عن عمرو روایت کریں

تو یہاں بھی ابن مرۃ مراد ہوں گے۔

۱۹۔ عبداللہ بن وھب جب عن عمرو روایت کریں

تو اس سے مراد ابن الحارث المصری ہوں گے۔

سند میں فقط محمد نام ہو تو کس جگہ کون سا راوی ہو گا؟

۲۰۔ محمد جب عن عبداللہ بن المبارک روایت کریں

تو یہاں محمد سے مراد محمد بن مقاتل مروزی ہیں۔

۲۱۔ جب محمد عن ابی معاویۃ الضریر روایت کریں

تو محمد سے مراد ابن سلام البیکندی ہیں۔

۲۲۔ محمد جب شعبۃ بن الحجاج سے ان کی کسی نسبت کے بغیر روایت کریں

تو وہاں محمد سے مراد محمد بن جعفر البصری معروف بغندر ہوں گے اور ہر بصری سند جس میں محمد بن جعفر ہوں تو وہ محمد یہی مذکورہ غندر ہیں۔

۲۳۔ محمد بن جعفر جب عن سلیمان بن بلال المدنی روایت کریں

تو وہاں محمد سے مراد محمد بن جعفر بن ابی کثیر ہیں اور ہر مدنی سند جس میں محمد بن جعفر نام کا راوی ہو تو وہ یہی محمد مدنی ہیں، غندر نہیں ہیں۔

۲۴۔ جب محمد عن ابی ھریرۃ روایت کریں

تو ہر حالت میں وہ محمد بن سیرین ابو بکر البصری ہوں گے۔

۲۵۔ محمد جب عن جابر بن عبداللہ روایت کریں

تو محمد سے مراد ابن المنکدر ابو بکر المکی ہوں گے۔

۲۶۔ محمد بن زیاد جب عن ابی ھریرۃ روایت کریں

تو غالب طور پر وہ محمد بن زیادہ الجمحی ہوں گے۔

۲۷۔ محمد جب عن عبدالرزاق الصنعانی روایت کریں

تو اس جگہ محمد سے مراد ابن سلام البیکندی ہیں۔

۲۸۔ محمد جب عن عبدہ بن سلیمان الکلابی روایت کریں

تو اس جگہ محمد سے ابن سلام البیکندی ہیں۔

عبداللہ بن مبارک سے روایت کرنے والے احمد کون ہیں؟

۲۹۔ احمد جب عن عبداللہ بن المبارک روایت کریں

تو احمد سے یہاں احمد ابن محمد المروزی المعروف بالسمسار المشہور بمردویہ ہیں۔

عبداللہ بن مبارک کی روایات:

۳۰۔ عبدان جب عن عبداللہ ھکذا روایت کریں

تو عبداللہ سے عبداللہ بن المبارک المروزی مراد ہیں کیوں کہ وہ دونوں مروز کے باشندے ہیں۔

۳۱۔ محمود جب عن ابن المبارک روایت کریں

تو محمود سے محمود بن غیلان المروزی مراد ہوں گے۔

سند میں حماد نام ہو تو اس سے کون سے راوی مراد ہیں:

۳۲۔ بخاری شریف میں جب حماد نام آئے

تو اس سے حماد بن زید البصری ابو اسماعیل مراد ہیں۔

۳۳۔ حماد بن سلمہ الکوفی، امام بخاری نے ان سے کوئی بھی مسند حدیث روایت نہیں کی البتہ ان سے متابعات میں لے کر آئے ہیں، امام مسلم نے ان سے کثیر مسند احادیث روایت کی ہیں بلکہ کبھی کبھی صحیح مسلم میں ان کی معرفت مشکل ہو جاتی ہے۔ بہر حال جب صحیح بخاری میں (مطلقاً) حماد کا ذکر ہو تو وہاں حماد بن زید البصری مراد ہوں گے، یہی مسلّم ہے۔

اسناد کے اندر یونس نام کے راویوں میں فرق کا طریقہ:

۳۴۔ یونس جب عن الزھری روایت کریں

تو یہاں یونس سے یونس بن یزید الایلی مراد ہوں گے۔

۳۵۔ یونس جب عن الحسن البصری و (عن) محمد بن سیرین روایت کریں

تو وہاں یونس سے مراد یونس ابن عبید البصری ہیں۔

۳۶۔ یونس جب عن ابن عمر روایت کریں

تو وہ یونس بن جبیر باہلی ابو غلاب البصری ہیں، انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ حضرت انس بن مالک پڑھائیں۔

اسناد کے اندر سعید نام کے راویوں میں فرق کا طریقہ:

۳۷۔ جب مطلقاً سعید عن ابی ھریرۃ روایت ہو تو وہ سعید بن مسیب ہوں گے۔

۳۸۔ سعید بن ابی سعید المقبری جب عن ابی ھریرۃ روایت کریں

تو اُس وقت سند میں ان کا مکمل نام مذکور ہوگا۔

۳۹۔ سعید جب عن قتادۃ روایت کریں

تو وہاں سعید سے مراد ابن ابی عروبۃ ہیں، کیوں کہ ان کی قتادہ سے روایات بہت زیادہ ہیں۔

۴۰۔ سعید جب عن ابن عمر روایت کریں

تو وہ سعید بن جبیر ابو محمد الوالبی البربری ہیں، اسی طرح جب سعید عن ابن عباس روایت ہو تو بھی یہی سعید بن جبیر مراد ہوں گے۔

اسناد کے اندر ھشام نام کے راویوں میں فرق کا طریقہ:

۴۱۔ ھشام جب عن ابیہ روایت کریں

تو وہ ھشام بن عروہ بن زبیر القرشی ہیں۔

۴۲۔ ھشام جب عن انس روایت کریں

تو اس سے ھشام بن زید بن انس ابن مالک الانصاری مراد ہوں گے اور یہ وہ ہیں جن کو حفید انس کہا جاتا ہے۔

۴۳۔ ھشام عن قتادۃ بن دعامۃ البصری روایت ہو

تو وہاں ھشام الدستوائی مراد ہوں گے اور اسی طرح جب ھشام عن ایوب السختیانی روایت ہو تو یہاں بھی ھشام الدستوائی ہی مراد ہوں گے۔

۴۴۔ ھشام جب عن ابن جریج اور عن معمر بن راشد روایت کریں

تو یہ ھشام بن یوسف الصنعانی ہوں گے، کیوں کہ یہ ان دونوں سے روایت کرنے میں خاص ہیں۔

۴۵۔ ھشام جب عن محمد بن سیرین روایت کریں یا عن حفصۃ

تو وہ ھشام بن حسان الفردوسی ہوں گے۔

۴۶۔ امام بخاری سند کو جب روی عن ھشام بیان کریں

تو وہ ھشام بن عبد الملک الطیالسی ہوں گے۔

۴۷۔ ھشام الدستوائی عن یحییٰ بن ابی کثیر بھی روایت کرتے ہیں۔

اسناد کے اندر مسلم نام کے راویوں میں فرق کا طریقہ:

۴۸۔ امام بخاری جب عن مسلم روایت کریں

تو مسلم سے مراد ابن ابراھیم الفراھیدی ہیں۔

۴۹۔ ہمیشہ جب کوئی سند میں مسلم نام کا راوی ہو تو لازماً وہ ابن صبیح الکوفی ہوں گے اور وہ اپنی کنیت ابی الضحی کے ساتھ بھیلاتے ہیں، اور کبھی کبھی مسلم بن ابی عمران الکوفی البطین ہوں گے۔

اسناد کے اندر یعقوب نام کے راویوں میں فرق کا طریقہ:

۵۰۔ یعقوب جب شیخ البخاری ہو

تو وہ یعقوب بن ابراہیم الدورقی ہیں۔

۵۱۔ یعقوب جب شیخ شیخ البخاری ہوں

تو وہ یعقوب بن ابراہیم الزھری ہوں گے۔

۵۲۔ یعقوب جب عن ابی حازم روایت کریں
تو وہ یعقوب بن عبد الرحمن الاسکندرانی ہیں۔

اسناد کے اندر حمید نام کے راویوں میں فرق کا طریقہ:

۵۳۔ حمید جب عن انس روایت کریں
تو وہ حمید بن ابی حمید الطویل البصری ہیں۔

۵۴۔ حمید جب عن ابی ھریرۃ روایت کریں
تو وہ حمید بن عبد الرحمن ابن عوف الزھری ہیں۔

اسناد کے اندر یحیی نام کے راویوں میں فرق کا طریقہ:

۵۵۔ امام بخاری جب حدثنا سعید فرمائیں
تو وہ ابن یحیی ابن سعید الاموی ہوں گے۔

۵۶۔ مسدد البصری جب عن یحیی روایت کریں
تو وہ یحییٰ بن سعید القطان ہیں۔

۵۷۔ مالک بن انس جب عن یحیی روایت کریں
تو وہ یحییٰ بن سعید الانصاری ہیں۔

۵۸۔ یحیی جب عن انس ابن مالک روایت کریں
تو وہ یحییٰ بن سعید الانصاری ہوں گے۔

۵۹۔ یحییٰ عن عمرۃ بنت عبد الرحمن الانصاریۃ روایت ہو
تو وہ مذکورہ بالا یحییٰ بن سعید الانصاری ہی ہوں گے۔

۶۰۔ محمد بن المثنی جب عن یحیی روایت کریں
تو یحییٰ سے یحییٰ بن سعید القطان مراد ہوں گے۔

۶۱۔ یحییٰ جب عن ابی زرعۃ روایت کریں
تو وہ یحییٰ بن سعید ابن حیان التیمی ابو حیانہیں۔

۶۲۔ معاویۃ بن سلام جب عن یحیی روایت کریں
تو یحییٰ سے یحییٰ بن ابی کثیر مراد ہیں۔

۶۳۔ شیبان بن عبد الرحمن النحوی جب عن یحیی روایت کریں
تو یہاں بھی وہی مذکورہ بالا یحییٰ بن کثیر مراد ہیں۔

عبید اللہ العمری اور عبید اللہ المسعودی میں فرق کرنے کا طریقہ:

۶۴۔ یحیی بن سعید القطان جب عن عبید اللہ روایت کریں
تو عبید اللہ العمری ہوں گئے، نہ کہ عبید اللہ المسعودی۔

عبد الرزاق صنعانی سے روایت کرنے والے یحیی کا مکمل نام:

۶۵۔ جب یحیی عن عبد الرزاق الصنعانی روایت کریں
تو وہ یحیی ابن موسی البلخی ہوں گے۔

کوفی اور مدنی سند میں سلیمان نامی راوی کون ہیں؟

۶۶۔ جب کوفی سند میں سلیمان ہو تو وہ الاعمش ہیں۔

۶۷۔ سلیمان جب مدنی سند میں واقع ہو تو وہ سلیمان بن بلال المدنی ہیں۔

ایوب السختیانی عن محمد روایت ہو تو وہ ابن سیرین ہیں:

۶۸۔ ایوب السختیانی جب عن محمد روایت کریں
تو یہاں محمد سے مراد ابن سیرین البصری ہیں۔

اسناد کے اندر اسحاق نام کے راویوں میں فرق کا طریقہ:

۶۹۔ امام بخاری جب عن اسحاق بن منصور روایت کریں
تو وہ اسحاق بن منصور الکوسج ہیں کیوں کہ السلولی ان سے اعلی ہے۔

۷۰۔ اسحاق جب عن عبدالرزاق روایت کریں
تو وہ اسحاق بن نصر ہیں۔

۷۱۔ اسحاق جب عن خالد روایت کریں
تو اسحاق سے مراد ابن شاہین الواسطی ہیں جب کہ خالد سے مراد ابن عبداللہ الطحان الواسطی ہیں۔

خالد نام کے راویوں کی پہچان کا طریقہ:

۷۲۔ خالد بن عبداللہ الواسطی جب عن خالد روایت کریں
تو یہاں خالد سے مراد خالد ابن مھران ابو المنازل المعروف بالحذاء ہیں اسی طرح خالد عن عکرمۃ روایت ہو تو اس وقت بھی یہی خالد مراد ہوں گے۔

سند میں جب اسحاق اخبرنا کہیں تو یہ اسحاق کون ہیں؟

۷۳۔ جب اسحاق اخبرنا کہیں
تو اسحاق سے اسحاق بن ابراہیم بن راہویہ مراد ہوں گے۔

اسناد کے اندر اسماعیل نام کے راویوں میں فرق کا طریقہ:

۷۴۔ اسماعیل بن جعفر ہمیشہ مدنی سند میں ہی ہوں گے۔

۷۵۔ جب بصری سند میں اسماعیل واقع ہو
تو وہ اسماعیل بن علیۃ ہیں، اسی طرح جب روایت اسماعیل عن ایوب السختیانی ہو تو اس وقت بھی یہی مذکورہ اسماعیل مراد ہوں گے۔

۷۶۔ اسماعیل جب عن قیس بن ابی حازم روایت ہو
تو وہ اسماعیل بن ابی خالد ہوں گے۔

اسناد کے اندر علقمہ نام کے راویوں میں فرق کا طریقہ:

۷۷۔ جب علقمۃ عن عمر بن الخطاب روایت ہو
تو یہاں علقمہ ابن وقاص اللیثی مراد ہیں۔

۷۸۔ جب علقمۃ، عن عبداللہ بن مسعود روایت کریں
تو یہاں علقمہ ابن قیس الکوفی مراد ہیں۔

متفرق معلومات:

۷۹۔ حفص بن عمر الحوضی، شعبۃ ابن الحجاج سے کثیر روایات کرتے ہیں۔

۸۰۔ عمر بن حفص بن غیاث اپنے والد سے عن الاعمش کثرت سے روایات بیان کرتے ہیں۔(۱۶)

حوالہ جات:

۱. بغدادی، امام حافظ ابی بکر احمد بن علی ثابت، تاریخ بغداد، ج:۲،ص :۳۲۳، دار الغرب الاسلامی، بیروت، لبنان، طبع اول،۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء۔
۲. بغدادی، امام حافظ ابی بکر احمد بن علی ثابت، تاریخ بغداد، ج:۲،ص :۳۲۴، دار الغرب الاسلامی، بیروت، لبنان، طبع اول،۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء۔
۳. عسقلانی، الحافظ الامام احمد بن علی بن حجر شافعی، تھذیب التھذیب، ج:۱،ص :۲۷۴، دارالکتاب الاسلامی، قاہرہ، مصر ،سنہ ندارد۔
۴. بغدادی، امام حافظ ابی بکر احمد بن علی ثابت، تاریخ بغداد، ج:۲،ص :۳۲۵ ، دار الغرب الاسلامی،بیروت، لبنان ،طبع اول،۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء۔
۵. ایضاً۔
۶. بغدادی، امام حافظ ابی بکر احمد بن علی ثابت، تاریخ بغداد، ج:۲،ص:۳۳۰، دار الغرب الاسلامی، بیروت، لبنان، طبع اول،۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء۔
۷. ابن عساکر، امام ابی القاسم علی بن حسن شافعی، تاریخ دمشق،ج:۵۲،ص:۸۱ ، دار الفکر، بیروت، لبنان،طبع اول، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء۔
۸. عسقلانی، الحافظ الامام احمد بن علی بن حجر شافعی، ہدی الساری،ج:۱،ص:۵۱۸ ، عرب شریف،طبع اول،۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۱ء۔
۹. بغدادی، امام حافظ ابی بکر احمد بن علی ثابت، تاریخ بغداد، ج:۲،ص:۳۲۴ ، دار الغرب الاسلامی، بیروت، لبنان، طبع اول،۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء۔
۱۰. ابی غدۃ، علامہ شیخ عبدالفتاح ابو غدۃ حنفی، تحقیق اسمی الصحیحین و اسم جامع الترمذی،ص:۹ ، مکتب المطبوعات الاسلامیہ، حلب، شام،طبع اول، ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۳ء۔
۱۱. برکلمان، کارل بروکلمان، تاریخ الادب العربی، ج:۳،ص:۱۶۵، دار المعارف، قاہرہ، مصر، سنہ ندارد۔
۱۲. قنوجی، ابی طیب صدیق حسن خان، الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ، ص:۳۱۴، دار الجلیل، بیروت، لبنان،سنہ ندارد۔
۱۳. ذہبی، امام شمس الدین احمد بن عثمان شافعی، سیر اعلام النبلاء، ج:۱۲، ص:۴۳۸ ، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، لبنان،طبع ثانی، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء۔
۱۴. یہ کتاب اب مفقود کے حکم میں ہے البتہ جامعہ قاضی عیاض(مغرب) کے استاذ الحدیث ڈاکٹر محمد بن زین العابدین رستم نے مختلف کتب سے اس کے اکتسابات کو جمع کرنے کے بعد ضروری تحقیق، تخریج اور حواشی کا کام کرکے ۲۰۰۸ء میں دار الکتب العلمیہ، بیروت سے ۱۲۸ صفحات پر شائع کروایا ہے اور راقم الحروف کے ذاتی ذخیرہ کتب میں اس کتاب کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ وللہ الحمد۔
۱۵. شیخ کے حالات عرب سے نکلنے والے مجلۃ الاصالۃ"، السنۃ الخامسۃ، العدد السابع والعشرون، ص:۷۹-۸۲سے اخذ کیے ہیں۔
۱۶. الکشی، فہد بن علی، القواعد المفیدۃ، مکتبہ ابن تیمیہ، قاہرہ، مصر،طبع اول،۱۴۱۳ھ/ ۱۹۹۲ء۔

تلامذۂ شیخ عبد الحق محدث دہلوی

ڈاکٹر محمد یونس قادری
ایسوسی ایٹ پروفیسر- انسٹی ٹیوٹ آف بزنس اینڈ ٹیکنولوجی، کراچی

Abstract:

Ulama hold an important position in Muslim society and played a significant role in Indian history. They have helped in preserving our hertiage and spread the teachings of Islam in significant ways. Many of them made sacrifices and stood up to safeguard the soul and sanctity of Islam in difficult times. Great names stand out from their noble ranks and Shaykh Muhaqqiq Abd al-Haq Muhaddith Dehlavi is one of them.

Shaykh Muhaqqiq Dehlavi spent his whole life for the implementation of Quran and Sunnah. His struggles for the spread of Hadith sciences stand unparralled to this day. He was the foremost authority who brought out the rich treasures of Hadith from Hijaz and spread them in the subcontinent through his books and students. Shaykh Muhaqqiq was guided and directed by his teachers to devote his life to these efforts. To achieve his purpose, he adopted four ways:

(a) Educate his sons: Shaykh Nur al-Haq 'Mashriqi', Shaykh Ali Muhammad and Shaykh Muhammad Hashim. They were all outstanding scholars of their era.

(b) Address letters to his sons, eminent scholars and Mashaikh of the time; and write treatises on important topics guiding them in important religious matters.

(c) Being an eminent scholar of Islamic sciences himself, he made an extensive and critical study of classical and other standard works in these fields and strove to disseminate them through his scholarly and spiritual netwroks.

(d) Prepare his students and deputies and send them to every city of the Sub-continent in order to spread the light of Islam and Hadith sciences.

This article will shed light on the life and achievements of Shaykh Muhaqqiq's major students and successors who played an important role in shaping the legacy of Hadith scholarship in the Indian sub-continent.

Key Words:

Hadith, Hadith Studies, Hadith Scholars, Muhaddithin, Hadith transmission in Indian Subcontinent, Shaykh Muhaqqiq, Abd al-Haq Muhaddith Dehlavi, Students and Successors of Shaykh Muhaqqiq, Hanafi Hadith Masters.

سترہویں صدی میں جہاں ایک طرف یورپ میں فکری بے چینی اور منتشر افکار کی دھوم تھی، وہیں ہندوستان میں کئی سیاسی و مذہبی تحاریک کی ابتدا ہوئی۔ ان میں ذکری، روشنائی، نقطوی، مہدی تحاریک، نظریۂ الفی اور شیعیت قابل ذکر ہیں۔ خود سیاسی مقتدر اعلیٰ اور اس کے رفقائے کار اپنی عقلیت پسندی کے سبب مختار کل ہونے کے دعوے دار تھے، ایسے میں ۱۰۰۰ھ میں حجاز اقدس سے تشریف لا کر حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے دہلی میں ایک دار العلوم قائم کر کے قرآن و سنت کی بنیاد پر اپنے تلامذہ کو ہندوستان کے مختلف علاقوں مثلاً: گجرات، احمد آباد، مراد آباد، بہار، کشمیر، جونپور، بنارس وغیرہ اور بیرون ہند دین متین کی ترویج واشاعت کے لیے بھیجا، یوں آپ کا سلسلہ ساری دنیا میں جاری ہوا۔

مغل فرمانروا اکبر کے نت نئے مذہبی اختراعات، غیر ملکی سفیروں، تاجروں، فوجیوں اور مذہبی پیشواؤں کی ہندوستان آمد سے فضا میں بہت بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے میں علما اور امرانے اعلائے کلمۃ الحق بلند کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لیکن اکبر کے ظالمانہ ہتھکنڈوں نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ان حالات میں عقلمندی اور حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ اکبر کے خلاف علی الاعلان لب کشائی کر کے جان داؤ پہ لگانے کی بجائے ایسے اسباب اور وسائل فراہم کیے جائیں جن سے الحاد و بد دینی کے سوتوں اور سرچشموں کو نیست و نابود کرنے میں مدد ملے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے یہی مؤخر الذکر راستہ اختیار کیا۔ اس حکمت عملی کے تحت انھوں نے اپنے تربیت یافتہ شاگردوں کو ہندوستان اور حجاز کے چپے چپے میں بھیجا کہ وہ اسلام کے شاندار اصول اور روایات کی پاسداری کریں۔ آپ کے چند ممتاز تلامذہ کا اجمالی تذکرہ درج ذیل ہے:

۱-شیخ طیب بن معین بنارسی (م:۱۰۴۲ھ):

سلسلۂ عالیہ قادریہ میں شیخ طیب بن معین نے حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے اجازت حاصل کی۔ آپ اپنے وقت کے مشائخ کبار میں سے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں پائی۔ بعد ازاں "مدرسہ شیخ نظام بنارسی" میں تکمیل تعلیم کی، نیز جونپور جا کر شیخ نور اللہ بن طہ جونپوری سے شرح وقایہ اور حسامی پڑھیں، وہیں شیخ خواجہ کلاں سے بیعت کی اور بنارس آ کر کچھ عرصہ ملازمت کر کے خواجہ کلاں کے مرید و خلیفہ شیخ تاج الدین جھونسوی کی خدمت میں رہے اور خلافت پائی۔ آپ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر سختی سے کار بند تھے۔ آپ کے خلفا اور مریدوں میں سے شیخ محمد رشید بن مصطفیٰ عثمانی جونپوری اور شیخ یٰسین بن احمد بنارسی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ۱۰۴۲ھ میں انتقال ہوا۔ مزار مبارک منڈواڈیہ، بنارس میں ہے۔

۲-شیخ جمال الدین کڑوی (م:۱۰۴۷ھ):

الشیخ العالم الکبیر العلامہ جمال الاولیا بن مخدوم جہانیاں بن بہاء الدین کی وساطت سے صوبۂ بہار میں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا فیضان حدیث پہنچا۔ ۹۷۳ھ میں بمقام کڑہ پیدا ہوئے۔ علم فقہ کی تعلیم والد ماجد سے پائی، پھر اودھ آکر قاضی ضیاء الدین عثمانی نیوتنی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے، کچھ عرصے بعد کئی مشہور طریقوں کی اجازت پا کر اپنے شہر واپس ہوئے اور درس و افادہ کا سلسلہ شروع فرمایا۔ آپ فقہ، اصول اور عربی کے بہت مشہور عالم تھے۔ سید محمد بن ابی سعید حسینی ترمذی کالپوی، شیخ لطف اللہ کڑوی، شیخ محمد رشید بن مصطفیٰ جونپوری اور شیخ یٰسین بن احمد بنارسی کے علاوہ کئی علما و مشائخ وقت نے آپ سے اکتساب فیض کیا۔ مولانا عتیق محدث بہاری نے اپنے شاگرد مولانا وجیہ امان اللہ پھلواری کو جو سند حدیث[۱] عطا کی، اس کے مطابق آپ کو علم حدیث کی اجازت حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے حاصل تھی۔ آپ نے ۱۰۴۷ھ میں وفات پائی۔

۳-مولانا محمد صادق دہلوی کشمیری ہمدانی (م:۱۰۵۳ھ):

آپ حضرت شیخ محدث کے ہونہار شاگردوں میں سے ایک تھے۔ ۱۰۰۰ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے، ابتداءً شیخ محمد فائز (م:۱۰۲۲ھ) کے تلامذہ میں سے تھے، بعد میں حضرت شیخ محدث کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ شیخ محدث آپ کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایک دفعہ آپ بیمار پڑ گئے، بیماری نے طول کھینچا تو حضرت شیخ ہر روز تسلی کے لیے خط لکھتے۔[۲] کبھی دن میں دو بار بھی۔[۳] رود کوثر میں آپ کی تصنیف طبقات شاہجہانی کے حوالے سے لکھا ہے:

قریباً ایک سو پچاس رقعات آں حضرت (شیخ محدث) نے اپنے دستخط شدہ مجھے بھیجے، جمع ہوئے۔[۴]

خود آپ کو حضرت شیخ سے کتنی محبت و مؤدت تھی، اس تعلق سے کلمات الصادقین میں رقم طراز ہیں:

"چوں کہ حضرت مخدوم کے بارے میں کچھ عرض کرنے اور بیان کرنے کی استطاعت نہ تھی اس لیے خاموشی اختیار کر لی اور اپنے آپ سے کہتا تھا:

چہ فروشی باد متاع سخن
کہ مبیع تو از خزینہ او ست

آنچہ تو بردکانی لب داری
این ہمہ از دعای سینہ اوست

”جس کے خزانے سے متاع سخن حاصل کی ہے، اسی کے ہاتھ سے بیچنا کس قدر نامناسب بات ہے؟
تیرے ہونٹوں کی دکان میں جو مال و متاع ہے، یہ سب اسی کی دعاؤں کا اثر ہے۔“

لیکن اس قول کے بہ موجب کہ اگر کسی کو کل حقیقت کا ادراک نہیں ہوتا تو جز کا ادراک تو ہو ہی جاتا ہے۔ آج دہلی ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان میں جو برکت، رونق اور خوبی نظر آتی ہے، آپ ہی کی ذات والا صفات کی بدولت ہے، جو اس عہد میں اہل معرفت اور اہل حقیقت کی سردار و پیشوا ہے اور جو مختلف علوم و فنون پر کامل عبور رکھتی ہے، بلکہ سچی بات وہی ہے جو اس عہد کے فاضل نے آپ کے بارے میں کہی:

”این مثل در عہد نوشد کہ شہری و گلی۔[اس عہد میں یہ کہاوت تازہ ہوگئی ”تو حلاوت ہے اور خوشبو ہے۔“]۔“[۵]

مولانا صادق دہلوی نے فیضان طریقت حضرت خواجہ باقی باللہ سے پایا تھا۔ آپ کو حضرت خواجہ سے والہانہ عشق تھا، اس کا اندازہ کلمات الصادقین میں آپ کے تذکرہ کے عنوان سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔[۶]

۱۰۵۳ھ میں آپ نے وفات پائی۔ کلمات الصادقین، طبقات شاہجہانی اور سلسلۃ الصادقین آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔[۷]

نزہۃ الخواطر[۸] میں آپ کی ایک اور تالیف ”حکایت الراشدین“ کا نام بھی ملتا ہے۔

٤- مولانا حیدر پتلو بن فیروز کشمیری (م:۱۰۵۷ھ):

موصوف کشمیر کے رہنے والے تھے۔ سات سال کی عمر میں حفظ قرآن کریم کے بعد بابا قطب الدین اور جوہر ناتھ کشمیری کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ مؤخر الذکر کے شاگردوں میں آپ کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔[۹] فقہ، حدیث اور تفسیر کی تکمیل حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے کی۔[۱۰] دہلی سے واپسی پر کشمیر میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی ساری عمر درس و افادہ میں صرف ہوئی۔[۱۱]

۱۰۵۷ھ میں وفات پائی۔ خیر الوریٰ تاریخ وفات ہے۔[۱۲] ان کے بعد ان کے صاحبزادوں: مولانا محمد طاہر کشمیری[۱۳]، مولانا محمد افضل کشمیری اور متبنی شیخ محمد منور کشمیری نے علوم اسلامیہ کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ عہد عالمگیری کے ممتاز عالم دین میر ہاشم منور آبادی کشمیری بھی آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔[۱۴]

٥- مولانا شاکر محمد بن وجیہ الدین حنفی دہلوی (م:۱۰۶۳ھ):

آپ دہلی میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے کی اور عرصہ دراز تک ان کی صحبت میں رہے۔ دہلی ہی میں ساری عمر درس و افادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ بادشاہ شاہجہاں آپ کا بڑا معتقد تھا اور نہایت احترام سے پیش آتا تھا۔ ۱۰۶۳ھ میں آپ نے وفات پائی۔[۱۵]

٦- شیخ ابو رضا بن اسماعیل دہلوی (م:۱۰۶۳ھ):

آپ نبیرۂ شیخ محدث میں سے تھے۔ صاحب عجالہ نافعہ نے آپ کو شیخ محدث کا نواسہ لکھا ہے۔ ”رسالہ در حال وفات“ میں ہے کہ انتقال سے ایک روز قبل آپ بھی شیخ محدث کے پاس موجود تھے۔[۱۶] شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے آپ کو حضرت شیخ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے، جن سے آپ کا سلسلہ سند آج تک قائم ہے۔[۱۷] شیخ ابو رضا بن اسماعیل دہلوی کا انتقال ۱۰۶۳ھ میں ہوا۔

٧- ملا عبد الحکیم سیالکوٹی (م:۱۰۶۶ھ):

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے رسالہ ”انسان العین فی مشائخ الحرمین“ میں بہ سبیل تذکرہ شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی تحریر فرماتے ہیں:

”وکتب شیخ عبد الحق دہلوی بہ میں واسطہ (ای بواسطہ شیخ عبد اللہ لاہوری) از مولانا عبد الحکیم روایت کند ودے از شیخ عبد الحق اجازۃ وروایۃ۔“

اس سے حضرت شیخ محدث کے ایک تلمیذ حدیث مولانا عبد الحکیم کا نام بھی معلوم ہوا اور ممکن ہے کہ یہ مولانا عبد الحکیم، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی ہوں۔[۱۸]

دیگر یہ کہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی کتاب تکمیل الایمان کے مترجم مولانا حکیم مطیع الرحمٰن قریشی نے بھی یہ لکھا ہے کہ:

”ایک روایت کے مطابق ملا عبد الحکیم سیالکوٹی بھی شیخ محدث کے تلامذہ میں سے تھے۔“[۱۹]

انھیں عہد شاہجہانی میں بڑا فروغ ہوا۔ دو مرتبہ بادشاہ نے سونے چاندی سے تلوایا۔ آپ کی تصانیف میں حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ شرح عقائد

تفتازانی، حاشیہ شرح شمسیہ اور تکملۂ حاشیہ عبد الغفور بہت مشہور ہیں۔[۲۰]ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کا انتقال ۱۰۶۷ھ میں ہوا۔

۸- شیخ نور الحق محدث دہلوی (م: ۱۰۷۳ھ):

آپ (۹۸۳-۱۰۷۳ھ) شیخ محدث کے فرزند اکبر تھے۔ محدث، فاضل اور معتبر عالم تھے۔ اپنے والد کے خلیفہ اور جانشین ہوئے، سلسلہ قادریہ اور شاذلیہ میں ارادت رکھتے تھے۔[۲۱]تعلیم و تربیت والد ہی سے پائی۔ شرح قرآن السعدین [۲۲]میں وہ لکھتے:

میرے والد ہی نے مجھے ا،ب کی تختی پڑھائی اور فارغ التحصیل کیا۔بادشاہ شاہجہاں ایام شہزادگی سے ان کی استعداد اور قابلیت کا معترف تھا۔ چناں کہ ۱۰۳۷ھ میں تخت نشین ہوکر بہ اصرار اکبر آبادی کی قضاۃ کا محکمہ آپ کے سپرد کیا۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

”حق ایں منصب نازک نواعے کہ باید بہ تقدیم رسانید۔“[۲۳]

شیخ محدث کی وفات کے بعد آپ نے اپنے والد کی مسند ارشاد کو سنبھالا۔ آپ کی مشہور تصانیف میں تیسیر القاری (شرح صحیح البخاری)، شرح شمائل ترمذی، محی القلوب، زبدۃ التواریخ، مثنوی تحفۃ العراقین، حاشیہ شرح عضدی، حاشیہ شرح مطالع، شرح قرآن السعدین، رسالہ در بیان رویا وغیرہ شامل ہیں۔ علم و ادب کا ذوق خاندانی ورثہ تھا۔ مشرقی تخلص کرتے تھے۔ آپ کا ایک دیوان بھی تھا، جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ آج کل نایاب ہے۔[۲۴]

۹- شیخ عبد اللہ دہلوی عرف خواجہ خرد (م: ۱۰۷۴ھ):

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے فیضان علم کی نشر و اشاعت کے سلسلے کی ایک اہم کڑی شیخ عبد اللہ دہلوی ابن خواجہ باقی باللہ (۱۰۱۰-۱۰۷۴ھ) ہیں۔ بچپن میں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، میر زا حسام الدین احمد کی آغوش تربیت میں پلے بڑھے۔ درسی کتب حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور شیخ شاکر محمد دہلوی سے پڑھیں۔ اس کے بعد سرہند جا کر بعض کتب حضرت مجدد الف ثانی سے پڑھیں اور فیضان طریقت بھی پایا۔ سرہند سے دہلی آکر شیخ حسام الدین اور شیخ الہداد سے اجازت طریقت حاصل کر کے مسند درس و افادہ پر متمکن ہوئے۔ آپ ایک عالم باعمل، بحر تصوف کے شناور اور وجد و سماع کے دلدادہ تھے۔ ابن عربی کے پیرو تھے اور ان کی کتب فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ پر حواشی لکھے۔ اس کے علاوہ تفسیر بیضاوی اور بعض درسی کتب پر بھی حواشی لکھے۔ آپ کی اہم کتب و رسائل میں رسالہ میراث، رسالہ مناقب شیخ حسام الدین، زاد المعاد، پردہ بر انداخت، طریق الوصول الی اصل الاصول۔[۲۵]مشہور ہیں۔ خواجہ خرد سے جن لوگوں نے فیضان حاصل کیا ان میں حضرت شاہ عبد الرحیم دہلوی[۲۶]اور شیخ خالد الدیر زوری کے نام بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ شیخ خالد کو دی گئی اجازت کی ایک قلمی نقل وزارت ثقافت (مصر) کے کتب خانے میں موجود ہے۔[۲۷]

۱۰- شیخ عبد اللہ لاہوری (م: ۱۰۸۳ھ):

شیخ عبد اللہ بن شیخ سعد اللہ حنفی اویسی لاہوری (۹۸۵-۱۰۸۳ھ)، شیخ محدث کے ان لائق ترین شاگردوں میں سے تھے جن کے شاگردوں میں دوسرے اور تیسرے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی[۲۸]کے استاد حدیث شیخ محمد حیات سندھی مدنی[۲۹] شامل ہیں۔ آپ نے تحصیل علم سے فراغ کے بعد مسند علم و ارشاد گجرات میں آراستہ کی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ”انسان العین فی مشائخ الحرمین“ میں لکھا ہے کہ آپ علم حدیث میں بالواسطہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے مستفیض تھے۔ گجرات میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد مکہ معظمہ پہنچ کر وہاں کے اساتذہ سے کسب فیض کیا،[۳۰]اور درس و افادہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی کے والد ابراہیم بن حسن الکردی المدنی نے آپ سے علم حدیث کی اجازت لے کر شیخ سالم بن عبد اللہ البصری المکی کو مستفیض فرمایا۔ شیخ سالم سے ان کے صاحبزادے شیخ عبد اللہ اور ان سے یہ علم شیخ محمد حیات سندھی، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اور مولانا سید محمد فاخر الہٰ آبادی جیسے جلیل القدر علما نے حاصل کر کے عرب و عجم میں اس کی اشاعت کی۔

۱۱- شیخ محمد رشید جونپوری (م: ۱۰۸۳ھ):

آپ (۱۰۰۰-۱۰۸۳ھ) کا سلسلۂ نسب اٹھارہ واسطوں سے شیخ کبیر سری بن مغلس سقطی عثمانی تک پہنچتا ہے۔ جونپور کی نواحی بستی ”برونہ“ میں پیدا ہوئے۔ فقہ و اصول کے ممتاز عالم تھے اور طریقت کے تمام علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ آپ کے متعدد اساتذہ میں استاد الملک محمد افضل بن محمد حمزہ عثمانی جونپوری نہایت مشہور عالم دین ہیں۔[۳۱]صاحب تذکرہ محدث، سمات الاخبار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”جب آپ حدیث کی تعلیم کے لیے دہلی پہنچے تو حضرت شیخ عبد الحق اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے مسند درس پر اپنے صاحبزادے شیخ نور الحق کو بٹھا چکے تھے۔ شیخ نے دیوان محمد رشید کی خاطر سے یہ منظور فرمایا کہ میری موجودگی میں تم نور الحق سے حدیث کا درس لو۔ چنانچہ شیخ عبد الحق کی موجودگی میں وہ شیخ نور الحق سے درس حدیث لیتے رہے یہاں تک کہ فراغت حاصل کی۔“[۳۲]

خرقۂ طریقت بچپن ہی میں آپ کے والد ماجد نے پہنا دیا تھا۔ فراغت تعلیم کے بعد شیخ طیب بن معین الدین سے چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور شیخ عبد القدوس بن عبد السلام سے قلندریہ، مداریہ اور فردوسیہ کے سلاسل طریقت کی خلافت پائی۔[۳۳] آپ کی خانقاہ طلباء کا مرجع اور سالکان راہ خدا کا مرکز تھی۔ آپ کا معمول تھا کہ روزانہ دوپہر تک علوم ظاہری کی تدریس اور دوپہر کے بعد تربیت باطنی فرماتے اور رات یاد الٰہی میں بسر کرتے۔[۳۴] شاہجہاں نے آپ کی شہرت سنی تو ملاقات کے لیے بلا بھیجا لیکن آپ نہ آئے۔[۳۵] آپ کی تصانیف میں سے رشیدیہ کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ شرح ہدایۃ الحکمۃ، شرح اسرار المخلوقات للشیخ الاکبر، خلاصۃ النحو، زاد السالکین، مقصود الطالبین اور ایک دیوان شعر مشہور تصانیف ہیں۔[۳۶]

۱۲- خواجہ معین الدین بن خواجہ محمود نقشبندی (م:۱۰۸۵ھ):

آپ کا شمار فقہائے حنفی اور مشائخ نقشبند میں ہوتا ہے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ علم فقہ اپنے والد ماجد حضرت خواجہ خاوند محمود المعروف حضرت ایشان (م:۱۰۵۲ھ) سے پایا، پھر دہلی چلے آئے۔ یہاں شیخ محقق کے دار العلوم میں رہ کر حدیث، فقہ اور اصول کی تعلیم پائی۔[۳۷] سلسلۂ نقشبندیہ میں اپنے والد کے مرید و خلیفہ تھے۔[۳۸] ۱۰۸۵ھ میں بمقام کشمیر فوت ہوئے۔ آپ شریعت کے پابند، سنت کو رواج دینے والے اور بدعت کو مٹانے والے تھے۔ زہد، تقویٰ اور پرہیزگاری میں بے نظیر اور اپنے زمانے کے علما و صلحا میں بے حد مقبول تھے۔ آپ کی تصانیف میں سے فتاویٰ نقشبندیہ، کنز السعادۃ اور رسالۂ رضوانی خاص طور پر مشہور ہیں۔[۳۹]

۱۳- شیخ محمد یحییٰ عرف شاہ جیو (م:۱۰۹۶ھ):

آپ حضرت شیخ احمد سرہندی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ مؤطا و دیگر علوم کی تکمیل حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے کی۔ آپ کی شادی حضرت خواجہ باقی باللہ کی پوتی (صاحبزادی حضرت خواجہ کلاں) سے ہوئی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر نے مدد معاش کے طور پر اتنا کچھ دیا تھا کہ "الملک الملت والملک الیحییٰ" ضرب المثل بن گئی۔ دینی علوم پر کئی کتب تصنیف فرمائیں۔[۴۰]

۱۴- شیخ عبد الجلیل الہ آبادی (م:۱۱۱۴ھ):

آپ سلسلۂ چشتیہ کے نامور بزرگوں میں سے ایک ہیں۔ ۹۹۲ھ میں بمقام مندارہ پیدا ہوئے، مختصرات اور مطولات دیگر اساتذہ سے پڑھ کر دہلی وارد ہوئے اور شیخ محدث سے اجازت حدیث حاصل کرنے کے بعد گنگوہ آکر شیخ محمد صادق حنفی گنگوہی کی خدمت میں بیس برس رہے اور فیض طریقت حاصل کیا۔ بعد ازاں الہ آباد میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ۱۱۱۴ھ میں وہیں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف میں نغمات حالات، علم الثقات، زاد المشائخ، اسرار العاشقین، حل المشکلات، فیوضات، چہارہ علمی، ہدایۃ الصوفیہ وغیرہ مشہور ہیں۔[۴۱]

۱۵- میر سید مبارک محدث بلگرامی (م:۱۱۱۵ھ):

قطب المحدثین میر سید مبارک محدث بلگرامی (۱۰۳۲-۱۱۱۵ھ) نے ساری عمر علم حدیث شریف کی خدمت میں گزاری۔ ۱۰۶۱ھ میں دہلی جا کر خواجہ خرد سے مطول تفتازانی کا درس لیا اور جتنا عرصہ دہلی میں رہے آپ کا قیام شیخ نور الحق دہلوی کے گھر پر رہا۔ ۷/رجب ۱۰۶۴ھ میں شیخ نور الحق دہلوی کے محضر سے اجازت حدیث شریف پائی۔ ۱۰۶۷ھ کو میر سید عبد الفتاح عسکری احمد آبادی[۴۲] سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہو کر بلگرام لوٹے۔ آپ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر بڑی سختی سے کاربند رہے۔ فیضان شیخ محدث، آپ کے جن شاگردوں کے ذریعے اندرون و بیرون ہند پہنچا ان میں سید طیب بن نعمت اللہ بلگرامی (م:۱۱۵۲ھ)، سید محمد فیض بن محمد صادق بلگرامی (م:۱۱۳۰ھ)، علامہ سید عبد الجلیل بن سید احمد حسینی واسطی بلگرامی (م:۱۱۳۸ھ)، سید طفیل محمد اترولوی بن سید شکر اللہ اترولوی بلگرامی (م:۱۱۵۱ھ) قابل ذکر ہیں۔

۱۶- مولانا ابو احمد سلیمان کردی گجراتی:

گجرات میں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا فیضان آپ ہی کی وساطت سے پہنچا۔ مرآۃ احمدی میں مرقوم ہے:

"از خدمت شیخ عبد الحق کسب فیوضات نمودہ۔ فاضل تبحر و صاحب تصانیف بودہ۔"[۴۳]

آپ کردستان کے رہنے والے تھے۔ خراسان و لاہور کی سیاحت کرتے ہوئے دہلی آئے، یہاں شیخ محدث کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ حدیث کی سند حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے شیخ (حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی) کے خلیفہ بھی ہوئے۔ غوث اعظم دستگیر سے والہانہ عشق اپنے شیخ طریقت و شریعت سے ملا تھا۔ "منبع الخیرات" نامی ایک مثنوی بھی آپ نے تحریر کی جو غوث پاک کی شان میں تھی۔ اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔[۴۴] حضرت محدث کا سلسلۂ حدیث مولانا سلیمان سے ان کے صاحبزادے مولانا احمد (م:۱۷۰۰ء) اور ان کے شاگردوں بالخصوص مولانا نور الدین گجراتی (۱۷۴۲-۱۶۵۳ء) سے پھیلا۔[۴۵]

۱۷-قاضی عنایت اللہ بن الہداد صدیقی بلگرامی:

شروع سے آخر تک اپنے والد گرامی قاضی الہداد سے تحصیل علم کے بعد مفتی شہر مقرر ہوئے۔ میر سید طیب بلگرامی بن میر سید عبد الواحد بلگرامی جب دہلی تشریف لائے تو قاضی عنایت اللہ کی خواہش پر حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے حلقۂ مریدین میں شامل کرا کے سلسلۂ عالیہ قادریہ کا شجرہ انھیں دلوایا۔[۴۶]

۱۸-شیخ یٰسین محدث بنارسی:

شیخ یٰسین بن احمد بن محمد ابراہیم صدیقی جونپوری بنارسی ۱۰۲۲ھ میں بمقام منڈواڈیہ (بنارس) پیدا ہوئے۔ حضرت شیخ محدث کے شاگرد و خلیفہ شیخ طیب بن معین بنارسی سے صرف و نحو و فقہ کی چند کتب پڑھیں۔ پھر جونپور آکر شیخ محمد افضل جونپوری اور شیخ محمد رشید بن مصطفیٰ جونپوری سے منطق، حکمت اور اصول کی کتب پڑھیں؛ سند حدیث شیخ نور الحق محدث دہلوی اور شیخ محمد رشید سے حاصل کر کے واپس منڈواڈیہ تشریف لائے۔ ۱۰۴۰ھ میں شیخ طیب بن معین نے آپ کو خلافت سے نوازا، ان کے بعد مسند ارشاد پر ساری عمر متمکن رہ کر مخلوق خدا کے لیے ایک نعمت ثابت ہوئے۔ آپ نے مناقب العارفین کے نام سے مشائخ کرام کا ایک مبسوط تذکرہ یادگار چھوڑا ہے۔[۴۷]

۱۹-شیخ محمد حسین خافی نقشبندی (م:۱۰۸۷ھ):

حضرت شیخ عبد الحق دہلوی کا سلسلۂ اسناد حجاز میں آپ سے بھی جاری ہوا۔ آپ مشہور عالم کتاب ”الطریقة المحمدیة فی بیان الطریقة النقشبندیة “ کے مصنف ہیں۔ حافظ سید عبد الحئی کتانی اپنی کتاب فہرس الفہارس والاثبات میں لکھتے ہیں:

”یہ خافی شیخ عبد الحق دہلوی کے تلمیذ ہیں اور عموماً ان ہی سے روایت کرتے ہیں۔ میں شیخ عبد الحق کی اس اجازت پر مطلع ہوا ہوں جو انھوں نے اپنے قلم سے انھیں لکھی ہے۔ شیخ خافی کو شیخ حسن عجیمی نے پایا ہے اور ان سے حدیث کی تحصیل کی ہے اور یہ نہایت عمدہ فائدہ ہے جسے لوگ کم جانتے ہیں۔“[۴۸]

سترہویں صدی عیسوی میں اسلام مخالف سیاسی، سماجی اور مذہبی تحاریک کے اثرات نے عوام و خواص کو اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا، ایسے میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا حجاز سے دہلی تشریف لا کر ایک دار العلوم قائم کرنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ تحفظ ناموس مصطفیٰ ﷺ اور علوم حدیث کی ترویج کے حوالے سے آپ کی حکمت عملی بذریعہ صوری و معنوی اولاد بہت کامیاب ہوئی، جس کے اثرات آج بھی پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور حجاز مقدس میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ ”برکۃ المصطفیٰ“ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ایک تاریخی شخصیت ہی نہیں بلکہ تاریخ ساز شخصیت کے طور پر اپنے ہم عصر علما میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱- قادری، سید احمد؛ تذکرۂ شیخ عبد الحق محدث دہلوی، پٹنہ: ۱۳۷۰ھ؛ ص: ۲۱۸-۲۲۰۔

2-Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum, p:1009.

۳- محمد اکرم، شیخ ڈاکٹر، رود کوثر ؛ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور ؛ ۱۹۷۰ء؛ص: ۲۱۹۔

۴- ایضاً؛ بحوالہ طبقات شاہجہانی۔

۵- دہلوی، محمد صادق، کلمات الصادقین ؛مترجم :لطیف اللہ ؛ادارہ انشر المعارف ، کراچی: ۱۹۹۵ء؛ص : ۱۸۴-۱۸۵۔

۶- ایضاً ؛ص: ۱۹۹-۲۳۸۔

7- Story, C.A. (1953) Persian Literature (Vol:1) London, p :1171.

۸- عبد الحئی ،علامہ، نزہۃ الخواطر؛ حیدر آباد دکن ؛ ۱۹۹۵ء؛ج:۵؛ص : ۳۷۸۔

۹-سروری، عبد القادر، پروفیسر ؛کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ سری نگر ؛ ۱۹۶۸ء؛ص : ۱۰۵۔

۱۰- رحمان علی ، مولوی؛ تذکرہ علماے ہند ؛مترجم: ڈاکٹر محمد ایوب قادری، کراچی ؛ ۱۹۶۱ء؛ص: ۱۷۲۔

۱۱- نزہۃ الخواطر ؛ ج: ۵؛ص: ۱۳۹۔

۱۲- جہلمی، فقیر محمد، ثم لاہوری، مولوی؛ حدائق الحنفیہ ؛لکھنؤ :۱۸۹۱ء ؛ص :۴۰۹۔

۱۳-نزہۃ الخواطر ؛ج: ۵/ ۳۸۲۔

۱۴- ایضاً؛ص: ۳۶۰۔
۱۵- نزہۃ الخواطر ؛ ج: ۵؛ص :۱۶۲۔
۱۶- اختر محمد سلیم، ڈاکٹر؛ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور مشائخ حرمین شریفین ؛ماہنامہ سیارہ، ج: ۳۵، شمارہ: ۱۳، دارالاشاعت مصنفین، لاہور ؛ ستمبر ۱۹۷۸؛ص: ۱۱۰۔
۱۷- دہلوی ،شاہ عبد العزیز محدث؛ فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ؛ مترجم : مولانا محمد عبد الحلیم چشتی؛ نور محمد کارخانہ کتب، کراچی ؛ ۱۹۶۴؛ص: ۳۹۔
۱۸- تذکرۂ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ؛ ص: ۱۵۷-۱۵۹۔
۱۹- دہلوی، شیخ عبد الحق حضرت محدث؛ تکمیل الایمان؛ مترجم: مولانا حکیم مطیع الرحمن قریشی؛ نذیر سنز، ۱۹۹۴، لاہور؛ ص: ۱۰ ۔
۲۰- محمد اکرام، شیخ ڈاکٹر؛ رود کوثر؛ ادارۂ ثقافت اسلامیہ ؛لاہور ؛ ۱۹۷۰ء؛ ص: ۳۹۰-۳۹۱۔
۲۱- انصاری، پسروری ، محمد اسلم بن محمد حفیظ ؛فرحت الناظرین؛ مترجم: پروفیسر محمد ایوب قادری، کراچی ؛ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان کانفرنس ،کراچی ؛ ۱۹۷۲ء ؛ص :۶۸۔
۲۲-دہلوی، شیخ نور الحق محدث؛ نور العین شرح قرآن السعدین، فارسی؛ نیشنل کمیٹی برائے سات سو سالہ تقریبات امیر خسرو ؛لاہور، ۱۹۷۵ء ؛ص : ا(ب)۔
۲۳- نظامی، خلیق احمد، ڈاکٹر؛ ۱۹۵۲؛حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی؛ مکتبۂ رحمانیہ ، لاہور؛ ۱۹۵۲؛ص: ۲۴۸؛بحوالہ مآثر الکرام ؛ ص: ۲۰۲۔
۲۴- ایضاً؛ ص :۲۴۷-۲۴۸۔
۲۵- نزہۃ الخواطر ؛ ج: ۶؛ص: ۲۶۶۔
۲۶- رود کوثر ؛ ص: ۲۱۴۔
۲۷-فہرس المخطوطات الفارسیہ ؛ لاہور؛ ۱۹۶۷ء؛ ص: ۱۲۸۔
۲۸- رود کوثر ؛ ص: ۲۱۵۔
۲۹- بلگرامی، میر غلام علی آزاد؛ سبحۃ المرجان ؛باہتمام ؛میر زا محمد شیرازی ؛ملقب بہ ملک الکتاب ، بمبئی ؛۱۳۰۳ھ ؛ص: ۹۵۔
۳۰- نزہۃ الخواطر ؛ ج:۵؛ ص :۲۵۳۔
۳۱- نزہۃ الخواطر ؛ ج: ۵؛ص ۳۶۹۔
۳۲-تذکرۂ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ؛بحوالہ سمات الاخبار؛ مؤلفہ حکیم مولوی عبد المجید ، کاتب مصطفیٰ آبادی ؛ ص: ۱۶۲۔
۳۳- نزہۃ الخواطر؛ج ۵؛ ص: ۳۶۹۔
۳۴- جونپوری، خیر الدین محمد، مولانا، تذکرۃ العلما؛ کلکتہ، ۱۹۳۴ء ؛ص: ۴۹۔
۳۵-کنبوہ ، محمد صالح عمل؛ صالح المعروف شاہجہاں نامہ ، کلکتہ، ۱۹۳۹ء ؛ ج: ۳؛ص: ۳۷۸۔
۳۶-نزہۃ الخواطر؛ ج :۵؛ص: ۳۷۰۔
۳۷-ایضاً؛ ص: ۴۰۶۔
۳۸- تذکرۂ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ؛ ص: ۱۷۰۔
۳۹- نزہۃ الخواطر ؛ ج: ۵؛ص: ۴۰۷؛حدائق الحنفیہ؛ ص: ۴۲۵۔
۴۰- سرہندی ، بدار الدین شیخ؛ حضرات القدس؛ مترجم: مولانا عرفان احمد خان، ۱۹۲۲ء؛ ج: ۲؛لاہور؛ ص: ۲۶۲۔
۴۱- نزہۃ الخواطر؛ ج: ۶؛ص: ۱۳۸۔
۴۲- بلگرامی، میر غلام علی آزاد؛ مآثر الکرام؛ آگرہ ؛ ۱۹۱۰ء ؛ص: ۱۰۱۔
۴۳- نور محمد عبد الکریم بن قاضی؛ مرآۃ احمدی، کلکتہ ؛۱۸۷۴، ج ۲ ص ۶۷۔
44- Rain, Charies, (1883). Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum(Vol: iii) London, p:1562.
۴۵- تذکرۂ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی ، ص: ۱۶۵۔
۴۶- بلگرامی، میر غلام علی آزاد؛ مآثر الکرام، آگرہ؛ ۱۹۱۰ء؛ص: ۲۲۸۔
۴۷- نزہۃ الخواطر؛ ج: ۵؛ص: ۴۳۴۔
۴۸- فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ ؛ ص: ۳۹۔ / فہرس الفہارس والاثبات ؛ ج: ۲؛ص: ۱۲۶۔

سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی-احوال و آثار

[۱۲۶۰-۱۳۴۸ھ/۱۸۴۴-۱۹۲۹ء]

مفتی عبد الخبیر اشرفی مصباحی

Abstract:

Sufis of repute and renowned spiritual orders migrated to the Indian sub-continent and made it the land of their spiritual and propagational activities. Among them was Sayyid Makhdum Ashraf Jahangir Simnani, a Sufi of extraordinary stature who engraved his eternal legacy in the books of Islamic history of the subcontinent. A new spiritual order- Ashrafiya was formed and spread by him with central spiritual hospice in Kichocha, a village which later grew into one of the most visited spiritual center in the sub-continent. Sayyid Makhdum Ashraf was succeeded by his adopted son and desciple - Sayyid Abdur Razzaq Jilani, from the lineage of Shaykh Abdul Qadir Jilani Baghdadi, and from this noble family came numerous great Sufis and Scholars of the Indian Sub-continent. Sayyid Ashraf Husayn Ashrafi Jilani Kichochavi was one of the great members of this legendary family and the fourteenth custodian of this spiritual hospice. This article will trace the exemplary life and contributions of Sayyid Ashraf Husayn to spiritual and Islamic sciences, and his deep relationships with the great Scholars and Sufis of his era.

Key Words:
Makhdum Sayyid Ashraf Jahangir, Ashrafiya, Sayyid Ashraf Husayn, Tasawwuf, Sufis, Kichocha, the Jilani Sayyids of Kichocha

حضرت مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی نے ۷۶۴ھ مطابق ۱۳۶۳-۱۳۶۴ء میں جب دوبارہ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوکر بھارت کی طرف واپسی فرمائی تو واپسی کے سفر میں وہ اپنی خالہ زاد بہن سے ملاقات کے لئے جیلان تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے اپنے بھانجے مخدوم الآفاق سید عبدالرزاق نورالعین جیلانی [ولادت: ۷۵۰ مطابق ۱۳۵۰ء- وفات: ۸۶۹ھ، مطابق ۱۴۶۵ء-یابقول دیگر: ولادت: ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۵۲ء- وفات: ۸۷۲ھ مطابق ۱۴۶۸ء] کو اپنا فرزند معنوی بنایا، انہیں اپنے ساتھ بھارت لے آئے اور پھر عمدہ تعلیم وتربیت کے بعد انہیں اپنا جانشیں کیا۔

مخدوم آفاق سید عبد الرزاق نور العین ابن سید عبد الغفور حسن جیلانی، محبوب سبحانی غوث اعظم سید عبد القادر جیلانی بغدادی کی اولاد سے ہیں۔نسب مبارک سید سیف الدین حموی کے واسطے سے محبوب سبحانی تک پہنچتاہے۔حضرت مخدوم آفاق نور العین نے مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی تعلیم حاصل کی، اس بات کا ذکر خود انہوں نے مکتوبات اشرفی کے خاتمہ میں کیاہے۔ علامہ جمال الدین بدخشانی سے علم ریاضی اور دیگر علوم ذہنیہ کی تحصیل فرمائی۔مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی نے ایک سال تک تعلیم وتربیت کے عوض میں علامہ بدخشانی کوایک لاکھ بیس ہزار دینار ادا کئے۔

لطائف اشرفی کے مطابق حضرت مخدوم آفاق کی پانچ اولاد نرینہ کی تعلیم وتربیت بھی خود مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی نے فرمائی تھی۔ بڑے صاحبزادے کا انتقال ان کی ظاہری حیات ہی میں ہوگیا تھا، باقی چار کو آپ نے خود علاقۂ ولایت وخلافت سپرد فرمایا۔سید شاہ حسن جیلانی سرکار کلاں کو کچھوچھہ، سید شاہ حسین جیلانی کو جون پور، سید شاہ فرید جیلانی کو بسوڑی بارہ بنکی اور سید شاہ احمد جیلانی کو جائس کی ولایتیں عطا کیں۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں مخدوم سید اشرف جہاں گیر نے قیام کیا تھا اور مریدین ومتوسلین کی ایک بڑی تعداد ان علاقوں میں موجود تھی۔ ان علاقوں میں اپنے نبیروں کو بھیجنے میں حکمت یہ تھی کہ فروغ دین کے لیے جو مشن آپ نے ان علاقوں میں شروع کیا تھا وہ سدا جاری وساری رہے۔

جانشین سید اشرف جہاں گیر، مخدوم الآفاق سید شاہ عبد الرزاق نور العین کا وصال ہوا تو خلف اکبر حضرت سید شاہ حسن جیلانی کچھوچھوی سرکار کلاں[م:۸۹۸ھ/۱۴۹۳ء] ان کے جانشیں ہوئے۔ زمانہ کروٹیں بدلتا رہا، وقت کی بگھی ماہ و سال کے پہیوں پر دوڑتی رہی، سرکار کلاں کے سجادے پر گلشن مخدوم کے رنگ برنگے پھول کھلتے رہے؛ اس باغ صد رنگ میں چودھواں گل سرسبد اشرف الصوفیاء، مرشد وبرادر اعلی حضرت اشرفی میاں، حضرت مولانا وملجانا سید شاہ ابو احمد اشرف حسین اشرفی جیلانی علیہ الرحمہ کی صورت میں کھلا، آپ چودھویں سجادہ نشیں کی حیثیت سے رونق آرائے مسند ہوئے۔ اہل خاندان ان کو "بڑے حضرت" کہا کرتے تھے، اور اہل علم کے نزدیک وہ اشرف الاولیاء اور اشرف الصوفیاء سے معروف تھے۔

مفتی محمود احمد رفاقتی نے ان کے خد وخال، حسن وجمال، فضل وکمال، جود ونوال، جلال وجمال، لباس وپوشاک اور مکارم آداب واخلاق کا نقشہ کچھ اس طرح سے کھینچا ہے:

"حضرت اشرف الاولیا[سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی] کا قد مبارک بلند تھا، پیشانی بڑی اور منور تھی، داڑھی مبارک بتوہ اور گھنی، چہرہ بیضاوی تھا، آنکھیں بڑی اور پُرجذب تھیں۔ لانبا کرتا اور نظامی پاجامہ استعمال فرماتے، سر پر نظامی دستار باندھتے، صدری زیب تن فرماتے، عصا مبارک ہاتھ میں ہوتا، کپڑا صاف ستھرا استعمال فرماتے، اس سے طبیعت کی نفاست کا حال معلوم ہوتا تھا۔ سخاوت اور عمیم الانسانی جبلت میں داخل تھی۔ آپ کے اطوار وحالات سے علمائے حقانی اور عرفائے ربانی کی شان نمایاں تھی۔ ظاہر، شریعت مطہرہ سے کمال درجہ آراستہ اور باطن، انوار اسرار ربانی سے درخشاں تھا۔ کمال ظاہری وباطنی کے اس بلند مقام پر فائز تھے، غوث کا نام نہ تھا، یگانۂ انفس وآفاق اور مکارم اخلاق کے آفتاب تھے۔ خلوص نیت اور صفائی باطن کا شہرہ عام تھا۔ آپ کی زندگانی میں روحانی واحسانی انوار، حکمت ودانش اور فراست مومنانہ کی جلوہ آرائی کی گہما گہمی تھی، بندوں کے درمیان خداوند قدوس کی عظمت شان کی خاص نشانی تھی۔"[۱]

ایک دوسری جگہ وہ تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ خانوادۂ اشرفیہ کے گوہر یکتا بلکہ سلسلہ عالیہ اشرفیہ کے تب وتاب۔ آپ نے خانوادۂ اشرفیہ میں علوم وفنون کے رائج نصاب کو تکمیل وتحصیل کا رواج ڈالا، ایسے ایسے اکابر دینی کی نگرانی وتربیت فرمائی کہ زمین وآسمان کی بلند مقامی معترف ہوئے، اور زمانہ ان کے فیض وبرکات سے بحر انور ہوگیا۔"[۲]

والدین کریمین:

اشرف الصوفیا، بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی، حضرت سید شاہ سعادت علی ابن سید شاہ قلندر بخش کے بڑے صاحب زادے تھے۔ حضرت سید شاہ سعادت علی جیلانی اپنے والد ماجد کے مرید وخلیفہ تھے۔ مولانا مفتی محمود احمد رفاقتی لکھتے ہیں:

"آپ[حضرت سید شاہ سعادت علی] خاندانی برکتوں کے امین وخازن تھے، طاعت وعبادت اور اتباع سنت میں بے نظیر تھے۔ تحصیل خلیل آباد بستی میں بسلسلۂ مختاری مقیم تھے، حکام کی نظروں میں مقبول اور عام وخاص میں محترم تھے۔ جب شاہی ختم ہوئی اور انگریزی عملداری ہوئی، آپ کچھوچھا شریف واپس آئے۔ ۱۲۹۲ھ میں حج وزیارت کا شرف حاصل کیا۔ آپ کا وصال ۲۳ربیع الآخر ۱۳۱۳ھ بروز یکشنبہ ہوا، خاندانی حظیرہ درگاہ معلی میں مدفون ہوئے۔"[۳]

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی والدۂ ماجدہ مخدوم شاہ نذر اشرف از اولاد امجاد شاہ راجو نبیرۂ شاہ جعفر لاڈ سرکار خورد کی صاحب زادی تھیں۔ نیک سیرت، پاکیزہ صفت اور خدا رسیدہ خاتون تھیں۔

ولادت باسعادت اور تعلیم وتربیت:

بڑے حضرت اشرف الصوفیاء سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی کی ولادت ۱۴ر جمادی الآخرہ ۱۲۶۰ھ مطابق ۳۰جون ۱۸۴۴ء بروز دوشنبہ کو ہوئی۔ جائے ولادت کچھوچھہ مقدسہ تھی اور مشہور نواب اودھ امجد علی شاہ[۱۲۵۸-۱۲۶۳ھ] کا عہد تھا-آپ نے خود اپنی تاریخ پیدائش لکھی اور اپنی مایہ

ناز تصنیف "انوار اشرفی" میں یوں نظم فرمائی:

چودہ جمادی ثانی دوشنبہ کا روز تھا بارہ
صدی پہ ساٹھ تھے ہجری سے برملا
تھے لکھنؤ میں، امجد علی شاہ ذو العطاء
پیدا فقیر، عہد میں اسلام کے ہوا۔[۴]

اور ۲/ذوالحجہ ۱۳۴۰ھ کے روزنامچہ میں بعنوان "تاریخ خود گفتم" کے تحت اپنی تاریخ پیدائش اس طرح تحریر فرمائی:

"اختر ہند" آمدہ سال ولادت ایں فقیر
چہاردہ بود از جمادی آخریں و یوم پیر
سال دیگر خود بجستم آمدہ "خورشید علم"
عہد شاہ لکھنو بود اے روشن ضمیر

خانوادۂ اشرفیہ کا طرۂ امتیاز اعلیٰ تعلیم اور تصوف وسلوک میں کمال رہا ہے۔یہاں ہمیں "ہمہ خانہ آفتاب است" کا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے،کتب بینی ان کا تفریح تھی، حضرت مولانا محمود عافی ان کے استاد خاص تھے،ان ہی کی خدمت میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ان کی علمی استعداد کا حال مفتی محمود احمد رفاقتی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"حضرت اشرف الاولیاء[سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی]علوم وفنون میں کامل، عشق ومعرفت میں فرد، نہایت بالغ الاستعداد اور ذہین وذکی اور اولوالعزم تھے۔علوم کی تحصیل مولانا عافی کی خدمت میں تکمیل کو پہنچائی۔آپ نے علوم تصوف وسلوک اپنے یگانۂ روزگار نانا محترم حضرت تاج الاولیا شاہ نیاز اشرف صاحب کے فیض توجہ سے مکمل کیا۔"[۵]

بیعت وخلافت اور وظائف کی اجازتیں:

بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین جیلانی علیہ الرحمہ اپنے نانا جان عارف باللہ سید شاہ نیاز اشرف کے مرید تھے۔انہوں نے یہ بات خود بتائی ہے اور بصورت نظم یوں کہا ہے:

ہے اشرف غریب مرید اس جناب کا
حضرت شاہ نیاز ولایت مآب کا[۶]

سید شاہ نیاز اشرف، سید شاہ راجو ابن حضرت حاجی چراغ جہاں ابن شاہ لاڈ ابن حضرت شاہ حسین سرکار خورد کے صاحب زادے تھے۔نابغۂ روزگار تھے، بلند ہمت اور عارف کامل تھے۔آپ کے چہیتے مرید سید شاہ حمایت اشرف اشرفی جیلانی نے آپ کی منظوم سوانح لکھی ہے۔حضرت سید شاہ عزیز اشرف صاحب نے پہلی بار اسے لکھنؤ سے شائع کرایا ہے۔مطبوعہ اشرفی پریس، ٹانڈہ کا نسخہ ہمارے پیش نظر ہے۔[اس نسخے میں کتاب کا تالیفی انتساب سید شاہ عزیز اشرف صاحب کی طرف کیا گیا ہے جو غلط ہے۔]اس منظوم سوانح کو جو بھی پڑھے گا، وہ برملا اعتراف کرے گا اور یہی کہے گا کہ:ان کی ذات سلوک ومعرفت کی عبقری تھی، خوف خدا میں ان کی زندگی گزرتی تھی، ان کے یہاں حقوق العباد کی بے پناہ پاسداری تھی۔ایک بار کچھوچھہ شریف میں وبا پھیلی تو انہوں نے لوگوں کی امداد میں اپنا سارا اثاثہ لٹادیا۔بہت سے طالبان راہ سلوک کو جام معرفت پلایا اور درجۂ کمال تک پہنچایا۔اپنے وصال سے چند روز پہلے شہر وبازار میں ڈھنڈورا پٹوایا، گلی کوچوں میں اعلان کرایا کہ:جو بھی قرض خواہ ہے، وہ آکر اپنا قرض وصول کرلے۔صرف ایک پیسہ ایک کہار کا باقی تھا، سو اس نے وصول کرلیا۔اپنے وصال سے پہلے اپنا کفن خود کاٹا، پھر لوگوں کو مخاطب کرکے اپنے خاتمہ بالخیر کا گواہ بنایا اور پھر جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔[۷]

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے اپنے مرشد گرامی کا مادۂ تاریخ وصال یوں لکھا ہے:

چوں فنافی اللہ شد آں عارف والاشیم
نامی نامی اونیاز اشرف عالی ہمم
دوم از ماہ ربیع آخر پس از نصف النہار
پیر من در یوم دوشنبہ شدہ سوئے ارم

بود ہر وصفے کہ درذات شریفش آشکار
اندریں یک مصرع تاریخ می آرم بہم
بے سروپاگشت اشرف در فراقش ایں ہمہ
عجز و فقر بخشش و زہد و عمل خلق و کرم
۱۲۷۸ھ

اسرار اشرفی میں تاریخ وصال کا قطعہ بزبان اردو یوں درج ہے:

تھا یک ہزار دو صد و ہفتا دہشت سال
ماہ ربیع آخر و تاریخ نیک فال
حضرت نیک دوسرے کو کیا یہاں سے انتقال
ڈوباوہ دوشنبہ کو من بعد از زوال

عارف باللہ سید شاہ نیاز اشرف اشرفی جیلانی نے بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو خوب سنوارا؛تعلیم وتربیت، نشست و برخواست اور خورد ونوش پر نظر رکھی؛ چال ڈھال، قال ومقال اور افعال واحوال کے طریقے سکھائے، اسرارسلوک ومعرفت کے قواعد بتائے، رموز طریقت وحقیقت کے فوائد اجاگر کئے، ذکر جلی وخفی کے آداب روشن کئے، زہد وتقوی اور ریاضت ومجاہدہ کے گر سکھائے۔مختصر یہ کہ سوز عشق میں تپایا، آتش شوق میں جلایا پھر کندن بناکر اپنی خلافت سے نواز دیا۔

بڑے حضرت کچھوچھوی پر مخدوم سید اشرف جہاں گیر کی نظر:

اشرف الصوفیاء بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی پر مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی کی خصوصی عنایات رہیں۔آپ کی روحانیت نے ہر موڑ پر ان کی نصرت فرمائی اور سفر وحضر ہر جگہ مخدومی روحانیت نے ان کی یاوری کی۔ہم یہاں بڑے حضرت کچھوچھوی کی عین جوانی کا ایک واقعہ درج کرتے ہیں، پھر جوں جوں مضامین کی وسعت ہوتی جائے گی مخدومی روحانیت کی رنگت بھی شوخ ہوتی جائے گی۔

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی تازگی کا زمانہ تھا، جسم ظاہر پر امراض کا ڈیرا تھا، ایک مہلک مرض نے سایے کی طرح گھیرا تھا۔طبیبوں اور حکیموں نے ہار مان لیا، کچھ افاقہ نہ ہوا۔روحانیت مخدوم سید اشرف جہاں گیر نے یاوری کی، دربار مخدومی میں حاضری ہوئی، پھر اسی چوکھٹ سے شفا ملی۔یہاں ایسا کامل علاج ہوا کہ زندگی بھر صحت وتندرستی نے ساتھ نہ چھوڑا۔بس آخری وقت میں چند ہی ایام بیماری میں کٹے۔مفتی محمود احمد صاحب نے لکھا ہے:

”حضرت اشرف الاولیا[بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ]قدس سرہ نے تقریبا اسی برس کی بڑی عمر پائی، صحت عموماً ہمیشہ معتدل رہی، آخری ایام قدرے علالت میں گزرے۔“

اتنی لمبی عمر، صحت ہمیشہ معتدل۔ایسا بہت کم ہوتا ہے۔یہ خاک درمخدوم کا اثر ہے۔اعلی حضرت اشرفی میاں کچھوچھوی لکھتے ہیں:

”حضرت عالی مرتبت جناب مرشدی ومولائی حاجی الحرمین سید ابو محمد اشرف حسین اشرفی جیلانی زاد اللہ فیضہ وبرکاتہ اوائل عمر میں جب آپ کی شادی نہیں ہوئی تھی، مرض بواسیر الانف میں مبتلا ہوئے۔گورکھپور میں ڈاکٹر محمد شائق کا علاج کراتے رہے مگر سوائے تکلیف روزمرہ اٹھانے کے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ناک کے نتھنوں میں اس قدر بدگوشت بڑھ آتا تھا کہ سانس لینا بھی مشکل ہوتا تھا۔اس کے بعد جراحوں کا علاج کرایا، اس سے بھی نفع نہیں ہوا۔یونانی طبیبوں میں حکیم علی افضل خان صاحب فیض آباد میں مشہور تھے، جب ان کو دکھلایا تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ ہم نے اس مرض کو اچھا ہوتے نہیں دیکھا، اکال دواؤں سے کچھ افاقہ ہوجائے گا مگر ازالۂ کلی مرض نہیں ہوسکتا۔حضرت مخدومی مایوس ہوکر کچھوچھہ شریف وطن کی طرف روانہ ہوئے۔آپ کے مکان پہنچنے سے پہلے میاں مردان شاہ فقیر درگاہ نے حضرت جدی ومولائی نانا شاہ نیاز اشرف قدس سرہ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ ”میرے نواسے سے جاکر کہہ دو کہ ادھر ادھر علاج کے لیے کیوں مارا مارا پھرتا ہے۔اپنے جد کے مزار پر درگاہ شریف میں آکر چلہ کرے، اچھا ہوجائے گا۔اِدھر حضرت مکان پر آئے، اُدھر میاں مردان شاہ درگاہ شریف سے آئے اور یہ بشارت لائے۔حضرت نے اسی وقت درگاہ شریف کے قیام اور چلہ کشی کا ارادہ کرلیا اور درگاہ شریف پہنچ کر حضرت محبوب یزدانی کے چراغ مبارک کا تیل لگانا شروع کیا۔چند روز میں صحت کامل ہوگئی۔ساٹھ ستر برس کا زمانہ گزرا ہوگا پھر کبھی مرض نے عود نہیں کیا۔کاسٹک اور تیزاب لگانے سے سخت تکلیف اٹھاتے تھے اور مرض بھی نہیں جاتا تھا۔حضرت محبوب یزدانی کے چراغ کا تیل لگانے سے نہ کچھ سوزش ہوئی نہ کچھ تکلیف معلوم ہوتی تھی۔اور اس بدگوشت پر جو تیل لگاتے تھے، پانی کی طرح گل کر بہتا جاتا تھا۔

اس شفائے مرض کی کرامت دیکھ کر کتنے بدمذہب وہابیوں نے اپنی بدمذہبیوں سے توبہ کی اور مان گئے کہ جس طرح سے اولیاء اللہ عالم حیات میں اپنی کرامات دکھلاتے ہیں اسی طرح بعد انتقال بھی اپنی قبر کے اندر سے تصرف کرتے ہیں۔"[۸]

مخدوم سید اشرف جہاں گیر سے اویسی نسبت:

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی ذات یکتائے روزگار تھی۔ ان پر براہ راست مخدوم سید اشرف جہاں گیر کی نظر تھی۔ ان سے بلاواسطہ بشارتیں اور ہدایتیں ملا کرتی تھیں، چناں چہ سلسلۂ ابو العلائیہ کی نسبت ان ہی کی ہدایت پر حاصل ہوئی۔ اعلی حضرت اشرفی میاں لکھتے ہیں:

"حضرت مخدومی و مولائی و مرشدی اخی الاعظم حاجی الحرمین الشریفین سید ابو محمد اشرف حسین زاد اللہ فیضانہ وبرکاتہ کو جب عالم روحانی میں حضرت محبوب یزدانی سے اشارۂ حصول ارشادِ تعلیم سلسلۂ ابو العلائیہ ہوا۔ آپ کو کسی قدر تامل ہوا کہ توجہ نظری کا طریقہ خاندان اشرفیہ میں نہیں ہے۔ دیکھا کہ حضرت محبوب یزدانی نے اویسیہ طور سے آپ سے بیعت لی اور توجہ نظری فرمائی۔

اس کے بعد حضرت مخدومی نے بہار شریف میں حضرت مرشد الانام اور مرجع خاص وعام حضرت مولانا سید امین احمد فردوسی ابو العلائی سے جاکر تعلیم وتربیت خاندان ابو العلائی بطور خاص حاصل کی اور سلاسل فردوسیہ قادریہ وچشتیہ ونقش بندیہ وغیرہ میں عام طور سے خلافت اور ارشاد حاصل کیا۔[۹]

اپنے مورث اعلی کی طرح مخدوم جہاں شرف الدین یحیٰ منیری سے اویسی نسبت:

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ جب منیر گئے، آستانۂ مخدوم جہاں پر حاضر ہوئے۔ مخدوم جہاں کا فیضان جاری ہوا۔ جس طرح بڑے حضرت کچھوچھوی کے مورث اعلیٰ مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی پر ابر کرم برساتھا، فیوض وبرکات کی بارشیں اُتری تھیں، اسی طرح بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ پر بھی نوازشات کی بارش ہوئی اور انہیں بھی اویسی نسبت سے شاد کام کیا گیا۔ یہ نسبت کیفیت پر منحصر ہوتی ہے، لفظوں میں اس کا بیان مشکل ہوتا ہے۔ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے اپنے روزنامچے میں اس کے اشارے دئے ہیں۔ روزنامچہ غیر مطبوعہ ہے، فی الحال ہمارے پیش نظر نہیں ہے تاہم اسے مطالعہ کرنے والے مفتی محمود احمد رفاقتی لکھتے ہیں:

"حضرت غوث العالم محبوب یزدانی مخدوم سید اشرف جہاں گیر قدس سرہ کو، حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحیٰ منیری قدس سرہ سے خاص علاقہ تھا۔ حضور پرنور اشرف الاولیا[بڑے حضرت کچھوچھوی] قدس سرہ کے روز نامچہ سے ثابت ہوتا ہے کہ: حضرت غوث العالم محبوب یزدانی کی طرح آستانۂ حضرت مخدوم جہاں سے فیض حاصل ہوا۔"[۱۰]

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ: یہاں مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی کا ذکر کریں اور ان کی اویسی نسبت کی بات کریں تاکہ مخدوم سید اشرف جہاں گیر کے پَرتو، بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی مخدوم جہاں سے اویسی نسبت کو سمجھ سکیں۔

مخدوم سید اشرف جہاں گیر عالمی سیاح بزرگ تھے، ان کو پاک طینت ونیک خصلت مشائخ سے ملنا بہت پسند تھا، جب تیسری بار پنڈوہ شریف کی طرف رخت سفر باندھا تو مخدوم جہاں شرف الدین یحیٰ منیری[ولادت: ۱۲۶۳ء-وفات: ۱۳۸۱ء] سے ملاقات کا اشتیاق ہوا۔ جب آستانۂ وصال تک پہنچے، دل کے ارمان بیٹھ گئے؛ کیوں کہ یہاں نظارہ ہی الگ تھا، مخدوم جہاں دائمی وصال پاچکے تھے اور نماز جنازہ کے لیے ان ہی کا انتظار ہو رہا تھا۔ نماز جنازہ ادا کی گئی، دن گزرا، شام ڈھلی، رات آئی اور مخدوم سید اشرف جہاں گیر نے قرب مقبرہ ہی رات گزاری۔ آگے کا واقعہ خلیفۂ مخدوم اشرف شیخ نظام الدین یمنی سے سنئے:

"شب درآمد درمقبرۂ شب گذرانیدند، روحانیہ شیخ عیاں شد، مکتوبات راامر بقرأت کردند وعنایت نمودہ ژندۂ خود را بحضرت قدوۃ الکبری تفویض فرمودند، چوں صبح سعادت دمید وخرقۂ نیلی شب فلک در برید حضرت قدوۃ الکبری طلب ژندہ کردند، اصحاب تمانع می کردند، فرمودند دریں جا مبالغہ بہمہ دیگر نسبت ندارد باید کہ ژندۂ شیخ برقبر شیخ نہند ہر کرانصیب خواہد بود بدست وی خواہد آمد، ہر ایک اصحاب بریں سخن آفرین کردند وژندہ برقبر داشتند، ہمہ اصحاب بہ نوبت دست کشاند بردست کسے نیامد چوں ہمہ دست کشیدند حضرت ایشاں دست کشادند، دست دراز کردند وہمچوں گل آں خرقہ رابرداشتند، وسردرراہ نہادند، چوں ژندہ در برکردند حالی غریب دست دادہ، زمانی سرفروکردہ نشستند۔"

مخدوم سید اشرف جہاں گیر نے مقبرہ میں ہی رات بسر کی، شیخ شرف الدین کی روحانیت ظاہر ہوئی، اپنے مکتوبات پڑھنے کا حکم دیا، اور مزید عنایت کرتے ہوئے اپنی گدڑی آپ کے سپرد فرمائی۔ جب صبح سعادت چمکی، آسمان نے رات کی نیلی گدڑی کو چاک کیا، مخدوم سید اشرف نے حضرت شیخ کی گدڑی طلب کی۔ اصحاب نے گدڑی دینے سے انکار کردیا۔ آپ نے فرمایا: اس دربار میں ایک دوسرے سے الجھنا مناسب نہیں، بہتر یہ ہے کہ شیخ کی گدڑی

شیخ کی قبر پر رکھ دی جائے، جس کسی کے نصیب میں ہوگی، اس کے ہاتھ آجائے گی۔ ہر شخص نے اس تجویز کی تعریف کی، گدڑی قبر پر رکھ دی گئی، ہر ایک نے باری باری اپنا ہاتھ پھیلایا کسی کے ہاتھ نہ آئی۔ جب سب نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے، آپ نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور گدڑی کو پھول کی مانند اٹھالیا اور سر پر رکھا، جب آپ نے وہ گدڑی (خرقہ) زیب تن کی، آپ پر عجیب طرح کا حال طاری ہوا۔ دیر تک سر نیچے کئے بیٹھے رہے۔"[۱۱]

ہم یہ دعوی نہیں کرتے کہ مخدوم سید اشرف جہاں گیر اور بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی اویسی نسبتیں کمّاً و کیفاً یکساں تھیں-ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو بھی حضرت مخدوم جہاں کی بارگاہ سے اویسی نسبت حاصل تھی۔

مختصر یہ کہ: مخدوم جہاں کی عنایتوں سے سلسلہ اشرفیہ کا دائرہ وسیع ہوا، اس میں سلسلۂ فردوسیہ کے فیوض وبرکات بھی سمٹ آئے، صدیوں اس سلسلۂ عالی کا فیضان کچھوچھہ سے بھی بٹتارہالیکن چوں کہ ہر عروج کا زوال ہوتا ہے سوسلسلہ فردوسیہ کو بھی کچھوچھہ میں اس زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر مخدوم سید اشرف جہاں گیر کی روحانیت نے یاوری کی اور بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی کے ذریعے سلسلہ فردوسیہ نے یہاں تجدید پائی۔

سلسلہ ابوالعلائیہ فردوسیہ کی دوسری خلافتیں:

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے منیر، بہار شریف کا سفر کیا تھا[آنے والے صفحات میں ہم اس کی تفصیل بیان کریں گے]۔اس سفر میں کثیر علما و مشائخ سے ملاقاتیں ہوئی تھیں، افادہ واستفادہ کی منزلیں ملی تھیں۔بہت سے علمانے آپ سے فیض پایا تھا اور کثیر مشائخ سے آپ نے اکتساب فیض کیا تھا۔جب آپ کی ملاقات مولانا الشاہ امین احمد ثبات فردوسی سجادہ نشیں آستانۂ مخدوم جہاں سے ہوئی تو وہ سماں ہی الگ تھا۔اسی ملاقات میں بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو سلسلۂ ابو العلائیہ فردوسیہ کی خلافتیں عطا ہوئیں۔مفتی محمود احمد رفاقتی لکھتے ہیں:

"حضرت مخدوم جہاں کے سجادہ نشیں حضرت رفیع الدرجہ امین الاولیا مولانا شاہ امین احمد ثبات فردوسی علیہ الرحمہ سے خصوصی رابطہ ہوا۔ روز نامچہ سے معلوم ہوا کہ ۱۹/ رجب المرجب ۱۳۰۱ھ میں بمقام خانقاہ معظم حضرت امین الاولیا سے خلافت خاصہ حاصل ہوئی۔"[۱۲]

مفتی صاحب مزید لکھتے ہیں:

"حضرت اشرف الاولیا سلسلہ ابو العلائیہ کا اجرا بھی جاری رکھا اور اہل سعادت کو اس سلسلہ کی اجازت بھی مرحمت فرماتے تھے۔"[۱۳]

بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی جامع سلاسل تھے، ان کو مختلف سلاسل کی خلافتیں حاصل تھیں-وہ معاصر شیوخ معرفت وطریقت کے سلاسل کا سنگم تھے۔علامہ سید غلام بھیک نیرنگ انبالوی لکھتے ہیں"جن[سید شاہ ابو محمد اشرف حسین اشرفی جیلانی] کو علاوہ خاندان اشرفیہ کے تمام مشائخ ہم عصر سے فیض صوری ومعنوی حاصل ہوا ہے۔"[۱۴]

ذیل میں چند اہم سلاسل کی فہرست دی جاتی ہے:

[۱]سلسلۂ قادریہ:-از والد گرامی سید شاہ سعادت علی اشرف اشرفی جیلانی، بمقام مدینہ منورہ ۱۲۹۳ھ۔

[۲]سلسلۂ چشتیہ نظامیہ سراجیہ اشرفیہ:-از ناناجان سید شاہ نیاز اشرف اشرفی جلانی، کچھوچھہ شریف۔

[۳]سلسلۂ عالیہ قادریہ جلالیہ اشرفیہ:-از تایاجان سید شاہ منصب علی اشرفی جیلانی، کچھوچھہ شریف۔

[۴]سلسلہ عالیہ قادریہ چشتیہ:-از سید شاہ رفیع الدین اشرف اشرفی جیلانی، جائس شریف۔

[۵]سلسلۂ نقشبندیہ ابو العلائیہ منعمیہ:-خواجہ امین احمد، سجادہ نشیں بہار شریف۔

[۶]سلسلۂ چشتیہ مودودیہ:-خواجہ سید صفدر حسن از خواجہ محمد بخش اللہ۔

[۷]سلسلہ اویسیہ:-از مخدوم سید اشرف جہاں گیر-و-از مخدوم جہاں شرف الدین یحیٰ منیری۔

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو شرفِ خلافت بخشنے والے مذکورہ حضرات صلحائے امت تھے، ان سب کو مختلف سلاسل کی اجازتیں وخلافتیں حاصل تھیں اور انہوں نے اپنے تمام سلاسل سے بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو بہرہ مند کیا۔ہم نے درج بالا فہرست میں جن سلاسل کی نشاندہی کی ہے وہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔[۱۵]

اشرف الصوفیابڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین علیہ الرحمہ کو کثیر اوراد ووظائف کی اجازتیں بھی حاصل تھیں، بعض اوراد ووظائف خاندانی ہیں، مخدوم سید اشرف جہاں گیر سے مسلسل معمولات مشائخ خانوادۂ اشرفیہ میں شامل ہیں۔ان کے علاوہ متعدد علما ومشائخ نے آپ کو اوراد ووظائف کی اجازتیں مرحمت فرمائیں۔دلائل الخیرات شریف کی خصوصی اجازت حاصل تھی۔مولانا محمد نعیم فرنگی محلّی[م:۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء]، مولانا سید شاہ عبد الغنی بیتھوی، مولانا سید شاہ محمد رضوان مدنی[م:۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء] اور مولانا عبد الحق ہندی مہاجر مکی[م:۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء] سے اجازتیں ملی تھیں۔ پھر آپ نے

اپنے مرید و برادر اصغر اعلیٰ حضرت اشرفی میاں کو اس کی اجازت عطا فرمائی۔ خلیفۂ اعلیٰ حضرت اشرفی میاں مولانا سید غلام بھیک نیرنگ صاحب لکھتے ہیں:

"دلائل الخیرات کی اجازت آپ [اعلیٰ حضرت اشرفی میاں] کو اپنے مرشد و برادر بزرگ مدظلہ کے واسطے حضرت مولانا ابوالاحیاء محمد نعیم صاحب فرنگی محلّی سے حاصل ہوئی۔ نیز دلائل الخیرات کی اجازت سید شاہ عبد الغنی بیتھوی اور حضرت سید محمد رضوان مدنی اور مولانا عبد الحق صاحب ہندی مہاجر مکہ معظمہ سے بواسطہ پیرومرشد و برادر بزرگ خود مدظلہ حاصل ہوئی۔"[۱۶]

سجادہ نشینی:

اشرف الصوفیا بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو سجادۂ سرکار کلاں پر ان کے تایا سید شاہ منصب علی نے بٹھایا۔ حق دار تک ان کا حق پہنچایا۔ سید شاہ منصب علی مردم شناس بزرگ تھے، کھرا کھوٹا خوب پہچانتے تھے۔ اہل و نااہل میں تمیز کرنا جانتے تھے۔ انہوں نے اپنے بھتیجے کو اہل پایا تو اپنی حیات ہی میں انہیں سجادہ نشیں بنادیا اور تاج خلافت سر پر سجاکر سند خلافت تھمادی۔ حیات مخدوم الاولیاء میں ہے:

"حضرت شاہ منصب علی صاحب نے رشد وہدایت میں زندگانی بسر فرمائی، صاحب صبر و رضا و توکل بزرگ تھے، ان کی ذات بابرکات مرجع انام تھی، خلائق کا ازدہام ان کے گرد رہتا تھا، سلسلۂ ارشاد وسیع تر تھا۔"[۱۷]

حضرت سید شاہ منصب علی صاحب کا وصال شب دوشنبہ، بعد نصف اللیل محرم الحرام سن ۱۳۰۷ھ کو ہوا۔ یوم دوشنبہ شام کو کنارۂ تالابِ نیر شریف مسجد کے پاس تدفین ہوئی - فرحمہ رحمۃ واسعۃ۔ آپ کا وصال کیا ہوا، پورا خانوادہ غم والم میں ڈوب گیا۔ ہر گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ سب سے زیادہ غمگین تھے۔ انہوں نے اپنا تایا ہی نہیں کھویا تھا بلکہ ایک جہاں کھودیا تھا۔ انہوں نے اپنے روزنامچہ میں بڑے رقت آمیز لہجے میں تاریخ وفات لکھی ہے:

دِلا! دنیا نہیں جائے طرب ہے
جو ہوئے زیست پر نازاں عجب ہے
شب دوشنبہ ماہ محرم
نوزدہ کو بپا شور و شغب ہے
وفات حضرت منصب علی شاہ
قیامت کا نمونہ ہے غضب ہے
لگا جب اشرفی تفتیش کرنے
کدھر وہ پیرِ و شاہ عرب ہے
کہا رضوان نے جنت کے محل میں
فنافی اللہ کریم الخلق ہے

۱۳۰۷ھ[۱۸]

زینت الاتقیا سید شاہ منصب اشرف اشرفی جیلانی سجادہ نشیں نے، اپنے بھتیجے اشرف الصوفیا بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی کو منصب سجادگی پر فائز کیا، اپنے سارے سلاسل طریقت کی اجازت دی اور سند خلافت وسجادگی تحریراً عنایت فرمائی۔ ذیل میں وہ سند درج کی جاتی ہے:

سند سجادگیِ سرکار کلاں

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والسلام علی رسولہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین

اما بعد فقیر حقیر سید منصب علی باجازت وخلافت پدر خود سید قلندر علی سجادہ نشیں، مرید وخلیفہ سید شاہ صفت اشرف سجادہ نشیں، مرید وخلیفہ سید شاہ محمد نواز سجادہ نشیں، مرید وخلیفہ برادر یک جدی سید شاہ نذر اشرف سجادہ نشیں، مرید وخلیفہ سید شاہ عنایت اللہ سجادہ نشیں، مرید وخلیفہ سید شاہ ہدایت اللہ سجادہ نشیں، مرید وخلیفہ سید شاہ نور اللہ سجادہ نشیں، مرید وخلیفہ سید شاہ عبد الرسول سجادہ نشیں، مرید وخلیفہ حضرت سید شاہ محمد سجادہ نشیں، مرید وخلیفہ سید شاہ محمد اشرف شہید سجادہ نشیں، مرید وخلیفہ حضرت سید شاہ حسن شریف سجادہ نشیں، مرید وخلیفہ حاجی الحرمین سید شاہ عبد الرزاق نور العین سجادہ نشیں وہم شیرہ زادہ مخدوم سلطان سید اشرف جہاں گیر قدس سرہ [تا جناب رسالت مآب احمد مجتبیٰ محمد مصطفی ﷺ]

چناں چہ فقیر را از والد ماجد اجازت وخلافت اشرفیہ نظامیہ، قادریہ سہروردیہ، نقش بندیہ حاصل است، ہم چناں برخوردار قرۃ العین سید اشرف

حسین مدعمرہ را اجازت دارم وخلیفہ نمودم سجادہ نشیں ساختم۔

کتبہ
سید منصب علی غفر اللہ ذنوبہ
۲۹/محرم الحرام ۱۲۸۵ھ[۱۹]

حضرت سید شاہ منصب علی اشرف جیلانی سجادہ نشیں نے اعلی حضرت اشرفی میاں کو ایک خط لکھا،اس خط میں بھی بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو خلافت وسجادگی پر فائز کرنے کا ذکر کیا۔خط کے الفاظ یہ ہیں:

سند اجازت بفرزند محمد اشرف حسین مدعمرہ کہ دادہ ام درو شکے وریبے نیست،چوں معاندان وحاسدان بر رسول وخدا از تہمت باز نہ آمدند مادر چہ حساب ام-........ان شاء اللہ ایں سلسلہ حسنی اشرفی تاقیامت بروئے روزگار برقرار خواہد ماند وحاسدین درحسد خواند مرد زیادہ، والدعا فوق المدعا۔"فرزند محمد اشرف حسین کو جو سند اجازت میں نے دی ہے،اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔معاندین اور حاسدین نے جب اللہ عزوجل اور رسول اللہ ﷺ پر تہمت لگانا نہیں چھوڑا تو میری کیا حیثیت ہے۔ان شاء اللہ تعالی سلسلۂ حسنی اشرفی قیامت تک جاری رہے گا اور حاسدین آتش حسد میں مزید جلتے رہیں گے۔[۲۰]

بڑے حضرت کچھوچھوی اور خانوادئہ اشرفیہ میں علمی وروحانی انقلاب:

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی شخصیت انقلابی تھی،ان کی قوتِ فکر عقابی تھی اور ان کی روش اعتدالی تھی۔وہ ایک فعال اور متحرک شیخ تھے۔مجد وشرف کے مواقع جانتے تھے،سرمایۂ افتخار کے مناصب پہچانتے تھے۔نسبتوں کی حفاظت ان کی پسند تھی،وقارِ خاندانِ نبوت کا تحفظ ان کا نصب العین تھا۔وہ کچھوچھہ مقدسہ کو روحانی وعلمی مرکز کی حیثیت سے دوبارہ دیکھنا چاہتے تھے۔اپنے مورث اعلی مخدوم سید اشرف جہاں گیر کے پیغام کو عالم اسلام میں پھیلانا چاہتے تھے۔انہوں نے اپنے مشن کے لیے تن من دھن کی بازی لگادی،انہیں خاطر خواہ کامیابی ملی اور ان کی حیات ہی میں کچھوچھہ مقدسہ میں علمی وروحانی چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ گلبن سادات تھے،انجمن افراد تھے،ان کی ذات وحدت میں کثرت کی مثال تھی،وہ ذہین وفطین ہونے کے ساتھ حساس واخاذ تھے،انہیں حالات زمانہ کا گہرا ادراک تھا،مستقبل کی ممکنہ تبدیلیوں پر ان کی عمیق نظر تھی۔ان کے پاس خاندانی وجاہت تھی،سیادت ونجابت تھی،علمی جاہ وجلال اور روحانی فضل وکمال ان کی ہشت پہلو شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے۔بلاشبہ وہ خاندانی سیادت پر علمی قیادت کا سہاگہ چڑھانا چاہتے تھے۔چناں چہ ان کی کاوشیں رنگ لائیں،محنتیں برگ وبار ہوئیں اور خانوادئہ اشرفیہ میں جلیل القدر علما ومشائخ کا ایک تانتا بندھ گیا۔تفصیل آگے آرہی ہے۔

خرقۂ مخدوم العالم شیخ علاء الحق پنڈوی کی واپسی:

اشرف الصوفیا بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی علیہ الرحمہ نے خانوادئہ اشرفیہ میں علمی وروحانی انقلاب لانے کے لیے چوطرفہ کاوشیں کیں۔نوجوانانِ خانوادہ کی علمی تشنگی کو بڑھانے،صوفی اقدار وروایات کے تحفظ اور وراثت مشائخ کی صیانت میں انمول حصہ لیا۔انہوں نے مخدوم العالم شیخ علاء الحق پنڈوی کا خرقہ دوبارہ حاصل فرمایا۔اس مبارک خرقہ کی مختصر روداد درج ذیل ہے۔

حضرت سید شاہ حسن شریف سرکار کلاں فرزند اکبر حاجی الحرمین سید شاہ نور العین کے نویں سجادہ نشیں،حضرت سید شاہ نذر اشرف تھے۔ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی،عدل وانصاف ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ان کے سامنے نگاہیں جھکی رہتی تھیں،سرنگوں رہتے تھے۔وہ لاولد تھے۔انہوں نے اپنی سجادگی اپنے چچازاد برادر بندہ نواز سید شاہ نواز اشرف کو دے دی۔سید شاہ نواز اشرف صوفی منش انسان تھے،دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو کر یاد الہی میں مشغول رہا کرتے تھے۔درویشی ان کی شان تھی،حصول جائداد کی تہمت سے وہ پاک تھے،صبر وشکیب ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ان کی گوشہ نشینی اور سادہ لوحی کا مفاد پرستوں نے خوب فائدہ اٹھایا،اور ورثہ خاندانی کو پامال کیا۔یہیں سے خلفشار وانتشار نے نیا رخ لیا اور صدیوں تک اپنا رنگ دکھایا۔پاکیزہ صفت علما ومشائخ کے دامن داغ دار ہوئے اور پاک طینت سادات کے اوصاف پراگندہ ہوئے۔

سید شاہ نذر اشرف سجادہ نشیں کی شادی سید شاہ عطا اشرف جیلانی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔شاہ عطا اشرف جائس،رائے بریلی کے باشندے تھے،سادات جائس کے مہر درخشندہ تھے اور ہمہ وقت فضل وکمال کی جستجو میں رہتے تھے۔جب سجادہ نشیں کا وصال ہوا تو وراثت خاندانی کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔زوجۂ سجادہ نشیں سیدہ بی بی اللہ رکھی ایک بہت ہی زیرک اور ہوشیار خاتون تھیں،بزرگ باپ کی بیٹی اور بزرگ سجادہ نشیں کی بیوی تھیں،مذہبی ماحول میں پلی بڑھی تھیں،خدا رسیدہ تھیں،سو مذہبی وراثتوں کی اہمیت خوب جانتی تھیں۔خانوادئہ اشرفیہ میں سب سے قیمتی اور روحانی ورثہ مخدوم العالم شیخ علاء الحق

پنڈوی کا خرقہ تھا، حاسدین سے حفاظت کی خاطر وہ اسے لے کر اپنے میکے جائس چلی گئیں، نتیجتاً سجادہ نشینان سرکارکلاں برسوں اس متبرک خرقہ کو زیب تن کرنے سے محروم رہے۔

سیدہ بی بی اللہ رکھی سید عطااشرف جائسی کی صاحب زادی اور سید مراد اشرف جائسی کی بہن تھیں۔یہ دونوں زہد و تقوی والے بزرگ تھے۔ان کی حیات ہی میں ان کا شہرہ عام ہو چکا تھا۔راقم الحروف نے ان بزرگوں کے آستانوں پر حاضری دی ہے، چلہ گاہ مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے عقبی حصے سے قدرے شمال اور پوربی صدر دروازہ سے قدرے جنوب، احاطۂ درگاہ معلی جائس میں آج بھی محفوظ ہیں۔سیدہ بی بی اللہ رکھی کی قبر بھی وہیں پر ہے۔

سیدہ بی بی اللہ رکھی سے وہ خرقہ منتقل ہوتا ہوا سید شاہ مراد اشرف جائسی تک پہنچا۔ پھر ان سے منتقل ہو کر سید شاہ رفیع الدین اشرف جائسی کو پہنچا۔سید شاہ رفیع الدین اشرف جائسی وہی بزرگ ہیں جنھوں نے بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین کچھوچھوی کو بغور دیکھا اور سنا تھا، ان کے زہد و تقوی اور فضل و کمال کی رعنائیاں بچشم خود ملاحظہ کی تھیں، ان کی سچائی اور دیانت داری کی وجہ سے انہیں خلافت سے بھی نوازا تھا، سو جب انہوں نے اپنے مجاز وخلیفہ کو اس خرقۂ مبارک کا اہل پایا تو خرقہ ان کے سپرد کر دیا۔

خانوادۂ اشرفیہ جائس کے رکن خاص سید محمد اشرف اشرفی جیلانی، سید شاہ رفیع الدین اشرف اشرفی جیلانی کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میاں رفیع الدین ناقل تھے کہ میرے دادا کی پھوپھی حضرت شاہ مراد اشرف صاحب قدس سرہ العزیز کو بیاہی ہوئی تھیں جو صاحبزادے حضرت شاہ عطا اشرف رحمۃ اللہ علیہ کے تھے، بعد انتقال شاہ مراد اشرف کے [خرقۂ شیخ علاء الحق پنڈوی] میرے یہاں اس توسل سے پہونچا تھا، کہ میں حضرت شاہ اشرف حسین کچھوچھوی کو کہ وہ اولادِ شاہ حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے، وارث سمجھ کر دے دیا اور یہی شہرت پذیر ہے۔“[۲۱]

نیز اسی کتاب کے ص:۲۲ پر درج ہے:

”پس شاہ رفیع الدین صاحب کے یہاں خرقہ جانے کا سبب یہ ہے کہ اللہ رکھی بی بی کی بھاوج زوجہ شاہ مراد اشرف، اپنے برادرزادہ شاہ غفور اشرف صاحب جد امجد شاہ رفیع الدین کے یہاں لے گئیں اور ترکہ شاہ عطا اشرف پدر اللہ رکھی بی بی میں شاہ رفیع الدین ڈیڑھ سہم کے حصہ دار بھی ہیں۔ارباب فہم ودانش پر یہ کیفیت بھی کھل گئی ہوگی۔“

حاصل کلام یہ ہے کہ: بندہ نواز سید شاہ نواز اشرف سجادہ نشیں کے زمانے میں خرقۂ شیخ علاء الحق پنڈوی سجادہ نشینان سرکارکلاں سے جدا ہوا، اس درمیان سید شاہ صفت اشرف اشرفی جیلانی، سید شاہ قلندر بخش اشرفی جیلانی اور سید شاہ منصب اشرف اشرفی جیلانی سجادہ نشیں ہوئے۔ان سجادگان سرکارکلاں کو آتش حاسدین نے جھلسایا اور اس مبارک خرقہ کو زیب تن کرنے سے محروم رکھا۔بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی نے بڑا کارنامہ انجام دیا، کہ خرقۂ مبارک کو دوبارہ خانقاہ حسنیہ سرکارکلاں میں واپس لا دیا-ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔لیکن انہیں بھی اس مبارک خرقہ کو زیب تن کرنے کا شرف حاصل نہ ہوا؛ کیوں کہ خرقہ کی واپسی کے زمانے میں انہوں نے اپنی سجادگی اعلی حضرت مولانا الشاہ سید علی حسین اشرفی میاں اشرفی جیلانی کے حوالے کر دی تھی، سو انہوں نے وہ مبارک خرقہ اپنے ہاتھوں سے اپنے خلف صادق کو زیب تن کرایا۔فالحمد للہ تعالیٰ-اعلیٰ حضرت اشرفی میاں علیہ الرحمہ نے پہلی بار جس عرس مخدومی میں خرقۂ مخدوم العالم شیخ علاء الحق پنڈوی کو زیب تن فرمایا وہ عرس ۲۸ محرم الحرام ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۸۸۰ء کو منعقد ہوا تھا۔

شہزادگان خانوادئہ اشرفیہ کی تعلیمی نگرانی:

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی عادت اچھی تھی، خصلت عمدہ تھی اور لیاقت بھرپور تھی۔ صدق مقال ان کا شیوہ تھا اور رزق حلال ان کا وطیرہ تھا۔ان صفات عالیہ سے ہر کوئی متأثر تھا۔وہ جو بات کہتے، مخاطب تاب انحراف نہ لاتا۔ان کی شخصیت متأثر کن تھی۔شخصیت سازی میں ان کو مہارت تھی، وہ ایک اچھے شخصیت ساز اور ذہن ساز تھے۔سب سے پہلے انہوں نے اپنے مرید باصفا برادر اصغر مولانا الشاہ سید علی حسین اشرفی جیلانی علیہ الرحمہ کو خوب سنوارا نکھارا۔ان کی ظاہری تعلیم کے لیے اچھے اساتذہ کا انتخاب کیا اور باطنی تعلیم سے بذات خود سرفراز کیا۔سلوک و معرفت کا ایسا جام پلایا کہ شاگرد میخانۂ عشق الہی کا متوالا ہو گیا۔ گویا ایک ذرہ تھا جسے ان کی تربیت نے آسمان ولایت کا درخشندہ آفتاب بنا دیا۔ ان کی تربیت نے ایسا دم خم دکھایا کہ شاگرد کے سامنے طریقت کے مہر و ماہ خم گشتہ رہے۔ان کا پروردہ علم و معرفت کا ایسا تاجدار ہوا کہ عباقرۂ دہر نے ان کے در کی جبیں سائی کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار جانا۔ان کا تربیت یافتہ ایسا باکمال ہوا کہ ان کے رخ زیبا کی زیارت ہی نے ان گنت نوابغ روزگار اور صنادید لیل ونہار کو زندگی کی معراج عطا کی۔ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کا طریقۂ تربیت سلوک دیکھئے:

وابستگان سلسلۂ اشرفیہ میں دو رکعت نماز کشود کار کے لیے ادا کی جاتی ہے۔ مجرب عمل ہے۔ ہزاروں نے استفادہ کیا ہے۔یہ بڑے حضور کچھوچھوی کا فیضان کرم ہے۔انہوں نے اپنے مرید صادق، برادر اصغر مولانا الشاہ اشرفی میاں کچھوچھوی کو یہ نماز تربیت فرمائی تھی۔تب سے سلسلہ جاری ہے۔وظائف اشرفی میں ہے:

"واسطے کشود کار اول شب جمعہ عروج ماہ سے شروع کرے، بعد ادائے نماز عشا دو رکعت نفل پڑھے، دونوں رکعتوں میں آیۃ الکرسی ایک بار اور سورہ اخلاص گیارہ بار پڑھ کر نماز تمام کرے، بعد ختم نماز ثواب اس کا بروح حضرت غوث العالم محبوب یزدانی سلطان سید اشرف جہاں گیر سمنانی قدس سرہ کو بخش دے، اس کے بعد گیارہ مرتبہ درود پڑھے اور سر برہنہ کر کے دو سو مرتبہ اس شعر کو پڑھے۔

اے اشرف زمانہ زمانے مدد نما
درہائے بستہ رازکلید کرم کشا

اس کے بعد گیارہ مرتبہ درود پڑھ کر اپنے مطلب کی دعا مانگے، ان شاء اللہ مراد حاصل ہوگی۔یہ عمل کم سے کم چالیس شب کرے۔ اجازت اس عمل کی ہمارے مرشد برحق [اعلی حضرت اشرفی میاں] دامت برکاتہم کو اپنے مخدوم اور مرشد حاجی سید ابو محمد اشرف حسین قدس سرہ العزیز سے حاصل ہوئی اور حضرت کو درگاہی اشرف بسوڑھوی سے اجازت ملی۔"[۲۲]

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ جب کسی کو خلافت دیتے تو اس کے علم کا پیمانہ ضرور دیکھتے۔اگر اگلے بندے کے پاس ان کی خلافت کے معیار کا علم ہوتا تو خلافت سے نواز دیتے، ورنہ علم ظاہر کے حصول کی ترغیب فرماتے۔اعلی حضرت مولانا الشاہ محمد علی حسین اشرفی میاں کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو بھی اس وقت خلافت ملی تھی جب وہ ظاہری علوم میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ان کو مرشد کی تلاش تھی، جن کی سربراہی میں وہ ریاضت ومجاہدہ کی راہ پر چلتے، سلوک ومعرفت کے رموز سیکھتے، تصوف واحسان کے اسرار جانتے اور گوشہ نشینی وخلوت گزینی کے متحمل ہوتے۔

مفتی محمود احمد رفاقتی لکھتے ہیں:

"تکمیل تعلیم کے بعد جذب الہی نے کشش کی اور آپ [اعلی حضرت اشرفی کچھوچھوی] کا میلان خاطر تصوف وسلوک کی طرف غیر معمولی طور پر ہوا۔اس گام پر آپ کے برادر حقیقی حاجی الحرمین، اشرف الاولیاء حضرت مولانا سید شاہ اشرف حسین صاحب قدس سرہ نے اپنا دست کرم آپ کی طرف بڑھایا اور آپ سے بیعت طریقت لے کر ۱۲۸۲ھ میں اجازت وخلافت عطا فرمائی اور راہ سلوک کی تعلیم وتلقین شروع فرمائی، مجاہدہ وریاضت اور بزرگان قدیم کی روش وطریقہ پر چلہ کشی کرائی۔"[۲۳]

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نوجوانان خانوادۂ اشرفیہ کو علم وفن کے شمس وقمر بنانا چاہتے تھے۔قوم مسلم کو اپنی نسل نو سے سجانا چاہتے تھے۔انہوں نے اس میدان میں حسن اقدام کیا، اور خانوادہ کے متعدد نوعمروں کو مختلف مراکز علم میں بھیجا۔حضرت مولانا مفتی محمود احمد رفاقتی نے اس کی تفصیل یوں درج کی ہے:

"حضرت اشرف الاولیاء [بڑے حضرت کچھوچھوی] قدس سرہ [سے] سلسلۂ عالیہ اشرفیہ نے ازسر نو تازگی وبہار پائی، آپ خانوادۂ اشرف کے گوہر یکتا بلکہ سلسلہ عالیہ اشرفیہ کے تب وتاب، آپ نے خانوادہ اشرفیہ میں علوم وفنون کے رائج نصاب کی تکمیل وتحصیل کا رواج ڈالا اور ایسے ایسے اکابر رجال کی دینی نگرانی وتربیت فرمائی کہ زمین وآسمان ان کی بلند مقامی کے معترف ہوئے اور زمانہ ان کے فیوض وبرکات سے بحر انوار ہوگیا۔فرزند ارجمند حضرت مولانا جعفر اشرف اور برادرزادہ حضرت مولانا شاہ احمد اشرف صاحب کے اخراجات کے کفیل ہوئے، کان پور اور علی گڑھ اور گورکھپور میں ان کی تعلیمی خبر گیری کے لیے تشریف لے جاتے، اپنے پوتے مولانا محی الدین اشرف اور برادرزادہ مولانا پیر مصطفے اشرف اور بھائی کے نواسہ حضرت مولانا سید محمد محدث کوپوری توجہ سے فرنگی محل میں تعلیم دلائی اور وہاں بھی تشریف لے جاتے، تعلیم ظاہری کے حصول کے بعد ان سب کو باطنی تعلیم وتلقین فرمائی، سلوک کے منازل طے کرائے۔"[۲۴]

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ جہاں دیدہ تھے، نباض ومزاج شناس تھے، وہ طالب علم سے زیادہ اساتذہ پر نگاہ رکھتے تھے۔ان سے ملتے، ان کے یہاں قیام کرتے، ان سے دوستی کرتے، دعائیں دیتے اور دعائیں لیتے، باغ مخدوم سمناں کے گلوں کو زیور علم سے سنوارنے سجانے کی باتیں کرتے۔ڈھلتی عمر کے باوجود گلستان خانوادۂ اشرفیہ کے زہرہ جبیں نوجوانوں کی تربیت گاہوں کا باربار چکر لگاتے۔چناں چہ اپنے ولد عزیز اور مرید خاص حضرت مولانا سید شاہ جعفر اشرف اشرفی جیلانی اور اپنے برادرزادہ عالم ربانی حضرت مولانا سید شاہ احمد اشرف اشرفی جیلانی کا داخلہ کرانے خود پہنچے۔ کچھوچھہ مقدسہ سے اٹھے، گورکھپور پہنچے، طویل سفر فرمایا اور مشکلات کا سامنا کیا۔استاذ العلما حضرت مولانا ابوالخیر معین الدین قدس سرہ رئیس کڑا مانک پور کی خدمت

میں ان شہزادگان کو پہنچایااور حسن تعلیم وتربیت کی خاطر انہیں ان کے سپرد کردیا۔[۲۵]
بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے دور میں فرنگی محل دار العلم تھااور دار العمل بھی،وہاں ایک سے بڑھ کرایک فضل وکمال کے بحر بیکراں تھے،علم وعمل کے نیر تاباں تھے،مجد وشرف کے لالہ ونسترن تھے،پابند واجبات وسنن تھے۔ان میں حضرت مولانا قیام الدین عبد الباری[م:۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء]عالم راسخ اور جبل شامخ تھے۔بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے پسرزادہ حضرت مولاناسید شاہ محی الدین اشرف اشرفی جیلانی کوان کے سپرد فرمایا۔مولانامحی الدین اشرف کی مکمل تعلیم فرنگی محل میں ہوئی،بڑے حضرت کچھوچھوی رحمہ اللہ داخلہ کرانے خود پہنچے،تعلیمی ترقی سے برابر آگاہ رہے۔جب دستار بندی کا وقت آیا،فرحت وانبساط سے دل اِٹھلایا۔کچھوچھہ سے اٹھے،فرنگی محل پہنچے اورجلسۂ دستار بندی میں شرکت کی۔مولانامفتی محمود احمد رفاقتی نے محی الملت حضرت مولاناسید شاہ محی الدین اشرف اشرفی جیلانی کا تعلیمی رپورٹ اس طرح لکھاہے:

”حضرت اشرف الاولیاء[بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ]نے اپنے دریتیم پوتے[مولانا محی الدین اشرف اشرفی جیلانی]کی پرورش وپرداخت بڑی فکرمندی سے فرمائی۔ابتدائی فارسی وعربی درسیات کی تعلیم کے بعد حضرت اشرف الاولیانے فرنگی محل دار العلم والعمل لے جاکر،امام العلماقیام الملت والدین حضرت مولانا شاہ محمد عبد الباری صاحب کے سپرد فرمایا۔حضرت فرنگی محلّی نے پورے انہماک وتوجہ سے آپ کو تعلیم دلانی شروع کی۔۲۱شعبان المعظم۱۳۳۷ھ کوخط آیاکہ سید محمد[محدث اعظم ہند کچھوچھوی]اور محی الدین اشرف درجہ نحو میں اول آئے۔حضرت قیام الملت والدین حضرت مولانا شاہ محمد عبد الباری،استاذ العلماءحضرت مولانا مفتی عنایت اللہ صاحب فرنگی محلّی،مولانا سلامت اللہ فرنگی محلّی اور حضرت مولانامفتی محمد قائم فرنگی محلّی علیہم الرحمہ سے بامعان نظردرس نظامی کی تکمیل فرمائی۔حضرت اشرف الاولیاءقدس سرہ نے روزنامچہ شریف میں بمقام لکھنوتحریر فرمایا:

”۲۱شعبان جمعہ ۱۳۳۴ھ ۲۳جون ۱۹۱۶ءاساڑھ ۱۳۲۳ فصلی کو نورچشم سید محمد اور نور چشم محی الدین اشرف مدعمرہ کی بعد نمازعشادستار بندی ہوئی۔“

اس جشن دستار بندی میں حضرت اشرف الاولیاءنے شرکت فرمائی اور دونوں کو اپنے ہمراہ کچھوچھامقدسہ لائے۔“[۲۶]

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ علم وعمل میں یکتائے روزگار تھے،ولایت ومعرفت کے چشمۂ سیال تھے،ان کے دورمیں خانقاہ معلی حسینیہ سرکارکلاں علم وعمل کا مرکز بنی ہوئی تھی۔یہاں دینداری کا غلبہ تھا،اور ولایت ومعرفت کا حیات بخش چشمہ رواں تھا۔ہرطرف سنت نبوی کی جاں فزا بہارتھی۔خانوادۂ اشرفیہ میں علمی وعملی اور سماجی ومعاشرتی بلندیاں اوج ثریاکو چھورہی تھیں۔

بڑے حضرت کچھوچھوی اورلطائف اشرفی کی اشاعت:

مخدوم سیداشرف جہاں گیر سمنانی علیہ الرحمہ کا شمارعباقرۂ دہرمیں ہوتاہے۔ان کی علمی وروحانی شخصیت کافیض آج بھی جاری ہے جسے ماتھے کی آنکھوں سے مشاہدہ کیاجاسکتاہے۔وہ درجنوں کتابوں کے مصنف تھے،فنون آشناتھے،حقیقت نگاراور زرنگارتھے۔انہوں نے قرآن کریم کی تفسیر لکھی،”اشرف الانساب“ اور” مناقب اصحاب“ لکھی ۔”اشرف الفوائد“ اور” فوائد الاشرف“تصنیف کی ۔آخری آرامگاہ[قبر]کے باہر ،قبرکے اندر،حضرمیں،سفرمیں،ہرحال میں قلمی یادگاریں چھوڑیں۔ ان کی بعض کتابیں طول زمانہ کے ہتھے چڑھ گئیں،انسانی نظروں سے روپوش ہوگئیں،بعض روشن رہیں مگرعیاں نہ ہوسکیں۔بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کواپنے مورث اعلی کی تصنیفات کی بڑی فکرتھی،وہ ہر حال میں ان تصنیفات کومنصۂ شہودپرجلوہ گردیکھناچاہتے تھے۔اپنے مرید باصفا،برادراصغر،اعلی حضرت،اشرفی میاں کچھوچھوی کے ساتھ مل کر اشاعت کاپلان بنایا،محنت ولگن کے ساتھ کام کیااورعملی طورپر حسن اقدام کیا۔ اس طرح ”لطائف اشرفی فی طوائف صوفی“،ملفوظات مخدوم اشرف جہانگیرسمنانی کی پہلی باراشاعت ہوئی۔ محدث اعظم ہندسید محمداشرفی کچھوچھوی لکھتے ہیں:

”افسوس کہ اب تک یہ کتاب[لطائف اشرفی]عام طور پر شائع نہ ہوسکی اور صرف ایک مرتبہ جنت مکان کلب علی خان صاحب بہادر والی ریاست رام پور–صین عن الشرور–نے اس کے طبع کی جانب توجہ کی۔ایسی ضخیم کتاب کاطبع کرانا آسان نہ تھا،پھربھی عالی جناب سید شاہ ابومحمد اشرف حسین صاحب قبلہ اشرفی جیلانی اوراعلی حضرت سید شاہ ابو احمد المدعومحمد علی حسین صاحب قبلہ اشرفی جیلانی سجادہ نشیں کی ہمت ومستعدی سے چھپی اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔“[۲۷]

ملی،سماجی اورتبلیغی اسفاراور علماومشایخ کی ملاقاتیں:

”حضرت اشرف الاولیا[سید شاہ ابو احمد اشرف حسین اشرفی جیلانی]قدس سرہ نے تبلیغ مذہب اسلام اور اِنصار مذہب اہل سنت اور تصفیہ قلب اور تزکیۂ باطن کے فریضہ کی ادائیگی میں کئی طرف توجہ صرف فرمائی،تصوف واحسان کازبردست کام کیا،علوم اسلامیہ کی ترویج واحیاء کے لیے جدوجہد فرمائی۔“[۲۸]

مذکورہ اقتباس کا حرف حرف صادق ہے۔بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی زندگی میں اس کا عکس موجود ہے۔ان کی شخصیت سیماب صفت تھی،پوری زندگی مرجع علما بن کر ملک کے آفاق پر چمکتے رہے،کثیر علما و مشائخ سے نسبتیں قائم کیں،قابل ترین علما و فضلا نے ان سے اکتساب فیض کیا۔ان کی خدمات اور کارناموں کا دائرہ گنگا جمنا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ان کے روزنامچوں میں اس کی تفصیلی روداد موجود ہے۔

شاہ امین احمد فردوسی اور بڑے حضرت کچھوچھوی:

مولانا الشاہ امین احمد فردوسی[ولادت ۲۳ رجب ۱۲۴۸ھ-وفات ۴ جمادی الآخرہ ۱۳۲۱]بہار شریف،پٹنہ -مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کی پوتی بی بی بارکہ کی اولاد سے تھے۔خانقاہ عالیہ بہار شریف کے معروف سجادہ نشیں تھے۔علم و فضل میں یکتا،اخلاق و کردار میں بے ہمتا بزرگ تھے۔صوفی صافی انسان،وافی کافی صاحب علم تھے۔علم ظاہر کا اکتساب بہار شریف کے مشاہیر علما سے کیا۔خانقاہ شیخ پورہ کے سجادہ نشین شاہ جمال علی بلخی سے مرید ہوئے،ان ہی سے شرف خلافت پایا،حضرت شاہ ولایت علی ابوالعلائی کی صحبت و ہدایت نے فیوض و برکات کا اکمال کیا،اور والد گرامی حضرت شاہ امیر الدین فردوسی نے بھی اجازت و خلافت سے سرفراز کیا۔شاہ امین احمد کو شعر و شاعری کا گہرا ذوق تھا۔فارسی میں ثبات اور اردو میں ذوق اور شوق دونوں تخلص فرماتے تھے۔مثنوی گوئی میں بڑا کمال حاصل تھا۔"شجرات طیبات"،"گل بہشتی"،"گل فردوس" اور "سلسلۃ اللآلی" آپ کی فارسی مثنویوں کے مجموعے ہیں -آپ کے فارسی و اردو کلاموں میں عشق حقیقی کی جھلک نمایاں ہے۔

حضرت شیخ امین احمد ثبات فردوسی نے حضرت مخدوم جہاں کی تعلیمات و کردار کو عوام الناس میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا۔ آپ کے خلفا، مریدین اور تلامذہ کی تعداد بہت بڑی تھی۔مزار حضرت مخدوم جہاں کے پائیں حلقہ سجادہ نشینان میں واقع ہے۔

مولانا الشاہ امین احمد فردوسی اور بڑے حضرت مولانا الشاہ سید اشرف حسین اشرفی جیلانی کے تعلقات گہرے تھے۔ان کی ملاقاتیں خوش گوار تھیں،محفل سماع میں دونوں کی شرکتیں رہیں،آفتاب و ماہتاب کی رونقیں دیکھی گئیں۔طالب و مطلوب کی جگہ محب و محبوب کا نظارہ دیکھنے کو ملا۔ان ملاقاتوں کا تفصیلی حال مفتی محمود رفاقتی کی کتاب "حیات مخدوم الاولیا" اور بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے "روز نامچہ" میں درج ہے۔حیات مخدوم الاولیا کی چند باتیں نذر قارئین ہیں:

"اشرف الاولیا[بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ جب منیر شریف پہنچے]حضرت حکیم ارشد علی صاحب کے دولت کدہ پر قیام فرما ہوئے،ایک خصوصی فیوض و برکات کی مجلس میں حضور امین الاولیا[مخدوم شاہ امین احمد فردوسی]نے فرمایا:

"ایک دو تین محفل سماع میں ہم دونوں کی شرکت ہو تو خوب ہو۔"

چھٹی شوال کو حضور فیض پناہ مخدوم جہاں کے عرس مبارک میں دوبارہ شرکت کی سعادت حاصل ہوئی تو محفل سماع میں یکجائی کا موقع ملا۔

حضرت اشرف الاولیا نے تحریر فرمایا:"سبحان اللہ محفل عاشقانہ جانبازانہ بود۔"

ساتویں تاریخ کو پھر سے محفل ہوئی،اس محفل میں شاہ مظفر صاحب فتوحہ شریف اور شاہ ڈمری صاحب[بھاگلپور]اکابر مشائخ صوبۂ بہار بھی شریک محفل ہوئے،حضرت جناب حضور امین الاولیا علیہ الرحمہ نے خاص توجہ فرمائی۔حضرت اشرف الاولیا[بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ]لکھتے ہیں:

"حضرت مخدومی برمن توجہ عینی و قلبی دوبارہ فرمودند،برقلب سنگم اثرے نشد۔"

بظاہر اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھی کہ حضرت غوث العالم محبوب یزدانی رضی اللہ عنہ کا قوی تر دست مبارک آپ کے قلب پر تھا۔

خطۂ بہار حضرت بہار شریف میں حضرت اشرف الاولیا[بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ [کی اطراف و دیار کے مشائخ حضرت شاہ برہان صاحب اور حضرت سید شاہ احمد صاحب کے ساتھ ملاقاتیں رہیں۔عرس پاک کی محفل میں حضرت مولانا شاہ علی حبیب نصر قادری مجیبی سجادہ نشیں خانقاہ مجیبی سے بھی ملاقات ہوئی۔"[۲۹]

اقتباس طویل ہوگیا مگر لاطائل نہیں ہوا۔بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ اور مشائخ بہار کے روابط و تعلقات آشکار ہوئے۔مراتب بندگان خدا سے واقفیت ہوئی-مختلف خانقاہوں کے سجادہ نشینوں کے باہم وابستگی دیکھنے کو ملی۔

استاذ الکل مفتی لطف اللہ علی گڑھی کی یادگاری ملاقات:

استاذ الکل مفتی لطف اللہ علی گڑھی ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے،"چراغ غم "مادۂ تاریخ پیدائش ہے۔دو چچا اور والد کے اکلوتے تھے۔نواب محمد حبیب الرحمن شروانی صاحب نے ان کا بچپنا نوٹ کیا ہے:

"بچپن کے ایک رفیق کا بیان ہے کہ لطف اللہ ان کھیلوں میں ہمارے شریک ہو جاتے جو شرفا کے لڑکے کھیلتے تھے،عامیانہ کھیلوں میں شرکت

نہ کرتے، مثلاً گولیوں کا کھیل، ہم جب ایسے کھیل کھیلتے تو وہ الگ بیٹھے دیکھتے رہتے۔ نماز کے بچپن سے عادی تھے۔"[۳۰]

حضرت استاذ الکل نے فارسی کی تعلیم مولوی عظیم صاحب اور اپنے خسر سید رونق علی سے، خطاطی اور انتہائی کتابیں اپنے پھوپھا مولانا حفیظ اللہ خان صاحب سے پڑھیں، اعلی تعلیم کی تکمیل مفتی عنایت احمد کاکوروی کی خدمت میں ہوئی۔ مفتی صاحب ان دنوں علی گڑھ میں تھے۔ جب تک وہ یہاں رہے، استاذ الکل ان سے تعلیم حاصل کرتے رہے؛ پھر ان کا تبادلہ صدر امین کے عہدہ پر بریلی ہو گیا، حضرت استاذ الکل بھی بریلی آ گئے۔

تکمیل تعلیم کے بعد استاذ الکل پہلے سرشتہ دار مقرر ہوئے، پھر کان پور کے "مدرسہ فیض عام" میں بحیثیت مدرس ان کی تقرری عمل میں آئی، پھر نائب صدر المدرسین اور صدر المدرسین کے عہدہ تک پہنچے۔ یہاں آپ نے سات سال قیام کیا اور بڑے انہماک کے ساتھ درس دیا۔

استاذ الکل کان پور سے علی گڑھ تشریف لائے اور "مدرسۂ جامع مسجد" میں عہدۂ صدر المدرسین پر مقرر ہوئے۔ یہاں آپ کی تدریس شباب پر تھی، جوق در جوق طلبہ آتے اور آپ کے چشمۂ علم سے سیراب ہوتے۔ عالم ربانی مولانا سید شاہ احمد اشرف اشرفی جیلانی اور محدث اعظم ہند مولانا سید محمد اشرفی جیلانی نے بھی آپ سے شرف تلمذ یہیں پر حاصل کیا، اور لطف و کرم اور علم و عمل کے اس بحر بیکراں سے خوب خوب جام علم و عرفان نوش فرمایا۔ آپ کے قدوم میمنت کی پابوسی کا شرف شہر حیدر آباد نے بھی پایا۔ یہاں چھ سال قیام رہا، عوام و خواص اور علما و نوابین کے منظور نظر رہے۔

استاذ الکل کو کل نوے برس کی عمر ملی، یوم عرفہ ۱۳۳۴ھ مطابق ۸/ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں آپ کا وصال ہوا۔ علی گڑھ میں شاہ جمال العارفین کے جوار میں آسودہ خاک ہیں۔

اعلی حضرت مولانا الشاہ سید علی حسین اشرفی میاں علیہ الرحمہ کے فرزند دل بند عالم ربانی مولانا الشاہ احمد اشرف اشرفی جیلانی، استاذ الکل مفتی لطف اللہ علی گڑھی کے خصوصی شاگرد تھے۔ تفسیر وفقہ اور معقول و منقول کی نہائی کتابیں ان ہی سے پڑھی تھیں۔[۳۱]

عالم ربانی مولانا سید احمد اشرف جیلانی جن دنوں علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی ان ہی دنوں علی گڑھ وارد ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا تجزیہ اس سفر کا مقصد خاص تھا، قیام استاذ الکل کے دولت کدے پر رہا۔ دو بحر بیکراں کا سنگم ہو گیا تھا، مسلسل ایک ہفتہ قیام رہا۔ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ استاذ الکل کے اخلاق و آداب سے متأثر ہوئے، اپنے روزنامچہ میں کلمات تحسین لکھے۔ وقت رخصت استاذ الکل نے بس اڈہ تک بڑے حضرت کی ہمراہی کی۔ مفتی محمود احمد لکھتے ہیں:

"حضرت اشرف الاولیا [سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی] اپنے برادر زادہ حضرت مولانا شاہ احمد کو دیکھنے کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ اور استاذ الکل، استاذ العلما مولانا المفتی محمد لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے مہمان ہوئے، ایک ہفتہ ان کے پاس مقیم رہے۔ حضرت اشرف الاولیاء علیہ الرحمہ نے مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے حسن اخلاق کی تعریف فرمائی ہے اور لکھا ہے کہ (صاحب) فضل و کمال بس اڈہ تک پہونچانے تشریف لائے۔"[۳۲]

سر سید احمد کا گھرانہ اور بڑے حضرت کچھوچھوی:

سر سید احمد [ولادت: ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷–وفات: ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء] سے کون واقف نہیں؟ ان کو مسلم قوم پرستی کا سرخیل اور دو قومی نظریہ کا بانی مانا جاتا ہے۔ وہ اسلام کو سائنس اور جدیدیت کے ساتھ ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ اس عقلیت پسند کی وکالت نے عالمی طور پر اسلامی اصلاح پسندی کو متاثر کیا اور نا قابل تلافی نقصان پہنچایا۔ وہ برطانوی حکومت کے وفادار تھے اور مسلمانوں کو بھی اس کی وفاداری پر زور دیتے تھے۔ وہ ۱۸۳۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہوئے، اور ۱۸۶۷ء میں چھوٹے مقدمات کے لیے جج مقرر کیے گئے۔

۱۸۵۹ء میں سر سید نے مراد آباد میں گلشن اسکول، ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں وکٹوریہ اسکول اور ۱۸۶۴ء میں سائنسی سوسائٹی برائے مسلماناں قائم کی۔ ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی، یہی کالج آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔

سر سید احمد کا گھرانہ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کا معتقد تھا، گھریلو معاملات میں بھی بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کا فیصلہ حتمی ہوتا تھا۔ سر سید احمد کے بھائی سید محمود [محمد] جج صاحب بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ سے بہت متأثر تھے، دونوں کے درمیان گہرے روابط و مراسم تھے۔ جائداد کی تقسیم میں انہوں نے بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو ثالث بنایا تھا۔ حیات مخدوم الاولیا میں لکھا ہے:

"سر سید کے بھائی سید محمود [محمد] احمد صاحب جج، حضرت کے معتقدوں میں تھے اور خصوصی روابط تھے، روزنامچہ کے ایک اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ جائداد کی تقسیم انہیں کی ثالثی میں ہوئی تھی۔ جج صاحب کی بھانجی اعلی حضرت مخدوم الاولیا [اشرفی میاں کچھوچھوی] کی مریدہ تھیں اور جج صاحب کے بہنوئی سید میر بادشاہ بھی معتقد خاص تھے۔"[۳۳]

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ جب علی گڑھ گئے تو علی گڑھ مسلم کالج بھی تشریف لے گئے۔ سرسید سے آپ کی ملاقات ہوئی، مسائل وحالات پر تبادلۂ خیال ہوا، پھر کچھ دنوں کے بعد سرسید کا انتقال ہوگیا۔ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے:

”سرسید کی شکل وصورت مسلمانوں جیسی ہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے توبہ کرلی تھی-واللہ تعالیٰ اعلم-“[۳۴]

”صحائف اشرفی“اعلی حضرت مولانا الشاہ سید علی حسین اشرفی کچھوچھوی کی تصنیف ہے۔اس کتاب میں سید میر بادشاہ کو سرسید کا داماد بتایا گیا ہے تاہم مفتی محمود احمد رفاقتی نے سید میر بادشاہ کو سید محمود[محمد]احمد جج صاحب کا بہنوی لکھا ہے۔یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔قارئین کرام سے گزارش ہے کہ ذیل کی چند سطریں گوارا کریں،بار نہ سمجھیں،تار سے تار ملائیں،کڑی سے کڑی جوڑیں،خانوادۂ سرسید اور خانوادۂ اشرفیہ کے مابین تعلقات دیکھیں، اور تطبیق کے لیے تفصیل قبول کریں۔حضرت اشرفی میاں کچھوچھوی کی تحریر سے دیدہ ودل پُرنور کریں۔

”میری اوائل عمر میں سید میر بادشاہ صاحب منصف مرحوم داماد سرسید احمد خان دہلوی کی نا کتخدا لڑکی پر آسیبِ جن ہو گیا تھا،انہوں نے ہر چند گنڈہ تعویذ عاملوں سے کرائے کچھ فائدہ نہ ہوا۔اس وقت سید میر بادشاہ مقام اکبر پور ضلع کانپور میں منصفی کرتے تھے۔وہاں پر ان کو کسی سے معلوم ہوا کہ درگاہ کچھوچھہ میں آسیب اور جن حاضر ہونے سے دفع ہوجاتے ہیں۔اس لیے دہلی سے اپنے بھائی سید زماں شاہ کو لڑکی کے ہمراہ کر کے درگاہ کچھوچھہ شریف میں بھیجا۔یہاں چند روز لڑکی نے قیام کیا تھا کہ اسی اثنا میں تعطیل کلاں میں جو ایک مہینہ کی ہوتی ہے ،میر بادشاہ منصف بھی درگاہ کچھوچھہ شریف میں حاضر ہوئے ؛اور جب زمانۂ تعطیل میں صرف دو ہفتہ باقی رہ گیا،حضرت محبوب یزدانی کے مزار پر حاضر ہو کر غلاف مبارک پکڑ کر بہت روئے اور یہ شعر پڑھا۔

باغ عالم میں نہ ہوگا کوئی ہم سا بے نصیب
آئے ایسے باغ میں اور خالی داماں لے چلے

اور عرض حال کر کے روتے ہوئے اپنی قیام گاہ میں آئے۔اسی شب کو مریضہ لڑکی نے خواب میں دیکھا کہ حضرت سیدہ فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا روضۂ مبارک کے دروازہ پر کھڑی ہیں اور حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہاں گیر قدس سرہ سے فرمارہی ہیں کہ: فرزند اشرف! یہ لڑکی میری ذریت سے ہے،اس پر جلد توجہ کرو کہ اچھی ہوجائے۔آپ نے عرض کیا کہ: ہمارے دربار میں ایک چلہ سے دوسرے چلہ تک ٹھہرانے کا معمول نہیں ہے،اگلی جمعرات کو اس لڑکی کو صحت کامل ہوجائے گی۔اور میر زمان شاہ مرحوم لڑکی کے چچا نے یہ خواب میں دیکھا کہ حضرت مخدوم سید اشرف جہاں گیر قدس سرہ بزبان فارسی فرماتے ہیں ”باذکر کبیر گی برود و علی بخش خادم ہمراہ رود۔“ صبح کو فقیر اشرفی جامع رسالہ ہذا سے اس خواب کی تعبیر پوچھی اور کہا کہ: اس عبارت کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔میں نے کہا کہ یہ اہل زبان کا کلام ہے،اس سے صحت مریضہ کی بشارت پائی جاتی ہے۔”باذکر کبیر گی برود و علی بخش خادم ہمراہ رود“ اس کا مطلب یہ ہے کہ مریضہ ہماری بڑائی کا ذکر تی ہوئی جائے اور علی بخش خادم ساتھ پہنچانے جائے۔چناں چہ دوسری جمعرات کو مریضہ قنات کے اندر بیٹھی ہوئی تھی اور باپ و چچا بھی اس کے پاس تھے کہ دفعتاً لڑکی پر جن تسلط ہوا۔عالم بیہوشی میں ہائے جلا،ہائے جلا،کی صدا بلند تھی اور لڑکی کے باپ دیکھ رہے کہ جیسے کسی نے قد آدم زمین سے اچھال دیا اور پھر زمین پر گری۔ وہ کہتے تھے کہ: میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس لڑکی کو صحت بھی ہوجائے گی کہ بار بار قدم آدم اچھل کر زمین پر گرتی ہے، ہڈیاں پاش پاش ہوجائیں گی۔ جب اس کو ہوش آیا اور صحت ہوئی تو باپ چچا دونوں نے پوچھا کہ تمہارے بدن میں درد تو نہیں ہوتا؟ کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟اس نے کہا نہ میری چوٹ لگی اور نہ کہیں درد ہوتا ہے۔بعد صحت دہلی مکان میں لائے اور اس لڑکی کی شادی کردی۔

چوں کہ اس لڑکی کو فقیر اشرفی جامع رسالہ ہذا کے ساتھ محبت واعتقاد کامل تھا،جب میں لطائف اشرفی چھپوانے دہلی میں آیا تو میر بادشاہ نے اپنی کوٹھی میں ٹھہرایا اور دو برس کامل تا اختتام طبع کتاب میری خدمت گزاری اور مہمان داری حد سے زیادہ کی اور وہ لڑکی فقیر کے ہاتھ پر مرید ہوگئی۔تیس برس کے بعد وہ دہلی میں بیمار پڑی،اس کی کشش قلبی نے یہ اثر دکھلایا کہ میں خود بمبئی سے دہلی آیا اور بروز انتقال تین گھنٹہ مرنے سے پہلے تجدید بیعت کی اور انتقال کرگئی۔اللہ تعالیٰ اس کو جنت نصیب کرے،حضور محمد ﷺ کے صدقے میں،حضرت محبوب الٰہی کے جوار میں دفن ہوئی۔[۳۵]

تاریخ نگار سرسید کے بارے میں لکھتے ہیں:

”سرسید کی شادی پارسا بیگم سے ہوئی تھی، جن سے ایک بیٹی عزیز النساز وجہ محمود حسن اور دو بیٹے سید حامد اور سید محمود تولد ہوئے۔“

سرسید احمد خان صاحب کی اولاد واحفاد کے تعلق سے حیات جاوید،ریاض الانساب، شجرات طیبات اور خطبات احمدیہ وغیرہ کتب میں یہی تفصیلات درج ہیں،ان کے داماد کا نام سید میر بادشاہ کسی کتاب میں راقم کو نہیں ملا۔

سرسید احمد خان صاحب کے بڑے بھائی سید محمد خان صاحب تھے،منصفی ان کا پیشہ تھا،بحیثیت جج انہوں نے مدتوں کام کیا۔نیک انسان تھے،اللہ والوں سے محبت کرتے تھے۔مولانا سید الطاف حسین حالی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"سید محمد خان کو بخار آنے لگا،تعطیل کے بعد جب سرسید جانے لگے تو رخصت کے وقت ان کے بھائی نے ایسے کلمات کہے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اپنے زندہ رہنے کی امید نہیں ہے۔اس کے بعد فی الواقع ان کا مرض بڑھنے لگا،وہ اسی حالت میں خواجہ باقی باللہ گئے،اور وہاں اپنی قبر کی خود جگہ تجویز کی،ہر چند لوگ کہتے تھے کہ ایسی بیماری نہیں ہے،تم کیوں ان خیال میں پڑے ہو؟ مگر ان کو مرنے کا یقین ہو گیا تھا،جب قبر تیار ہو گئی،سوار ہو کر وہاں پہنچے اور قبر میں اتر کر لیٹے اور قبر کو پسند کیا۔اب مرض اور بھی زیادہ ہو گیا،ایک دن شاہ احمد سعید صاحب کو جو اس وقت خانقاہ میں سجادہ نشیں تھے،بلایا اور ان کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی اور تیسرے دن انتقال کیا۔مفتی صدر الدین خان نے جو سرسید کو ان کی تعزیت کا خط بھیجا تھا تو اُس میں یہ شعر لکھا تھا:

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بہ دعا آرزو کنند

سرسید کی بہن کا نام صفیۃ النساتھا،ان کا انتقال کچھ کم نوے برس کی عمر میں دہلی میں ۱۸۹۲ء کو ہوا۔الطاف حسین حالی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

[وہ]"عورتوں میں ممتاز اور قابل تھیں،اکثر مذہبی کتابیں اور کچھ حدیث کی عربی کتابیں بھی مع ترجمہ کے پڑھی تھیں،اور ان کے گھر میں کنبے کی اکثر لڑکیاں جمع ہوتیں اور ان سے پڑھتی تھیں۔"[۳۶]

مفتی محمود احمد رفاقتی نے سرسید صاحب کے بڑے بھائی کا ذکر کیا ہے،ان کو جج لکھا ہے اور بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ سے ان کے تعلقات کے احوال لکھے ہیں۔یہ ساری باتیں تاریخی ہیں،ان پر پختہ ثبوت موجود ہے۔ہاں!ان کا نام محمود لکھا ہے،جب کہ ان کا نام "محمد" تھا،ممکن ہے کہ یہ سہو کتابت ہو،یا پھر تشابہ مادہ کی کارستانی ہو۔

مفتی محمود احمد رفاقتی نے لکھا ہے کہ:

"جج صاحب کی بھانجی اعلی حضرت مخدوم الاولیا[اعلی حضرت اشرفی میاں کچھوچھوی] کی مریدہ تھیں اور جج صاحب کے بہنوئی سید میر بادشاہ بھی معتقد خاص تھے۔" یہ بھانجی کون تھیں؟ سرسید احمد خان صاحب کی بہن صفیۃ النساکی دختر نیک اختر تھیں،ان کی شادی سید میر بادشاہ سے ہوئی تھی،اس رشتے سے سید میر بادشاہ سرسید کے داماد ہوئے۔اعلی حضرت اشرفی میاں کچھوچھوی نے اسی نسبت سے ان کو "سرسید کا داماد" لکھا ہے۔یہ ہمارا اخذ کردہ نتیجہ ہے،یہی تطبیق کا سیدھا راستہ ہے؛امید واثق ہے کہ بے خفا و بے حجاب ہے۔حضرت اشرفی میاں کچھوچھوی کا دہلی آنا جانا بہت ہوتا تھا،وہاں لوگ کثیر تعداد میں ان کے معتقدین تھے۔دو سال تک سید میر بادشاہ کے یہاں قیام رہا،آسیب زدہ لڑکی کی وفات پر ممبئی سے دہلی پہنچے۔لہذا واقعہ لکھنے میں غلطی کا امکان بعید از قیاس ہے،رشتہ ریکارڈ کرنے میں یقیناً رشتہ داری کا پاس ہے۔

نوابان شیروانی اور بڑے حضرت کچھوچھوی کے تعلقات:

نواب حبیب الرحمن خان شیروانی[ولادت:۱۸۶۶ء وفات:۱۹۲۶ء] عالم دین اور اردو ادیب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔آپ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۱۹ء تک جامعہ عثمانیہ کے پہلے وائس چانسلر رہے۔ان کی ابتدائی تعلیم آگرہ کالج میں ہوئی،اسی زمانے میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا،مختلف رسائل اور اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کیے۔۱۹۱۸ء میں ریاست حیدر آباد میں "صدر الصدور امور مذہب" کے فرائض سونپے گئے۔۱۹۲۲ء میں حکومت نظام کی طرف سے "نواب صدر یار جنگ بہادر" کا خطاب ملا۔۱۳ سال بعد اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ،حبیب گنج میں واپس آ گئے۔

بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی کچھوچھوی،مولانا نواب حبیب الرحمن شیروانی اور دیگر نوابین شیروانی کی دعوت پر حبیب گنج تشریف لے گئے۔حبیب گنج میں نصف ماہ قیام رہا،دین وسنیت کا کام ہوا،نوابین حبیب گنج نے بڑا اعزاز دیا۔حیات مخدوم الاولیا میں ہے:

حضرت اشرف الاولیا[بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی]نوابان شیروانی کی دعوت پر حبیب گنج گڑھی بھی تشریف لے گئے،پندرہ دن قیام فرمایا۔مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی اور ان کے چچا نے غایت تعظیم کی،یہاں حلقۂ ارشاد کی توسیع کے علاوہ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی کے خصوصی کتب خانہ کی بعض کتابوں کے مطالعہ میں (وقت) گزارے۔مولانا حبیب الرحمن شیروانی نے بعض نادر کتابیں ہدیۃً پیش کیں۔روز نامچے میں ان کے بارے میں تفصیلی احوال لکھے گئے ہیں۔"[۳۷]

شیخ محمد شبلی نعمانی کا خاندان اور بڑے حضرت کچھوچھوی:

مصنف شہیر شیخ محمد شبلی نعمانی [ولادت:۱۸۵۷ء-وفات:۱۹۱۴ء] نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی پائی،علامۃ العصر فاروق چریاکوٹی ان کے استاد

تھے۔بڑی محنت ولگن کے ساتھ مذہبی تعلیم مکمل کی، پھر وکالت کا امتحان بھی پاس کیا۔علی گڑھ گئے، سرسید احمد خان سے ملاقات ہوئی، ان کے کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔علم وفضل میں کمال کی وجہ سے نظام عثمان علی خان نے نظام آباد[حیدر آباد]بلایا، اعزاز واکرام بڑھایا۔۱۸۹۸ء میں علی گڑھ کی ملازمت ترک کرکے اعظم گڑھ آ گئے۔۱۹۱۳ء میں دار المصنّفین کی بنیاد ڈالی۔

شیخ محمد شبلی نعمانی ابتدامیں خوش عقیدہ تھے،ان کا شمار بڑے حضرت کچھوچھوی کے مریدین بااخلاص میں ہوتا تھا،ان کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب بھی بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے معتقد تھے۔بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے جب حج کیا، شیخ حبیب اللہ صاحب بھی ساتھ رہے۔ان کی والدہ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی مریدہ تھیں۔شیخ محمد شبلی نعمانی نے دورئہ نظام آباد کے موقع پر بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی دعوت بھی کی تھی۔حیات مخدوم الاولیامیں ہے:

”روزنامچہ مبارک سے معلوم ہواکہ شیخ محمد شبلی نعمانی مصنف شہیر بھی مرید بااخلاص سے تھے۔وہ مولانا فاروق چریاکوٹی علامۃ العصر کے نامور شاگرد تھے اور مولانا چریاکوٹی آفتاب ولایت حضرت مولانا شاہ محمد کامل ولیدپوری علیہ الرحمہ کے خواہر زادہ اور داماد تھے۔مولانا شبلی نعمانی کے والد مرحوم شیخ حبیب اللہ صاحب حضرت مولانا کامل کے خلیفہ،حضرت الٰہی بخش صاحب کے مرید تھے اور تصوف میں رغبت رکھتے تھے،اس لیے ان کا نام شبلی رکھا تھا۔مولانا فاروق چریاکوٹی نے نعمانی کا اضافہ کیا۔حضرت اشرف الاولیاء[بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ]نے علاقۂ نظام آباد کا دورہ فرمایا تو شبلی نعمانی نے دعوت کی۔روزنامچہ کے حاشیہ پر تحریر فرمایا کہ شیخ محمد نعمانی کے بھائی اور بنی اعمام عالم وفاضل ہیں،مولوی حمید الدین کے شاگرد ہیں۔“بعد کے حالات علامہ شبلی نعمانی کے بدل گئے تھے اور سرسید کی صحبت ومجالس کی وجہ سے ان کے اعتقاد ومذہب میں ناروا تبدیلی ہوگئی تھی۔“[۳۸]

مولانا شبلی نعمانی کی والدہ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی مریدہ تھیں۔اسی کتاب کے ص:۲۶ پر لکھا ہے:

”سبرہد ضلع جون پور میں حضرت مولانا شاہ محمد کامل ولیدپوری کے مرید خاص اور خلیفہ اجل حضرت الٰہی بخش شاہ عارف کامل تھے۔مولانا شبلی نعمانی کے والد انہیں کے مرید تھے اور مولانا کی والدہ حضرت اشرف الاولیا[بڑے حضرت کچھوچھوی]کی مریدہ تھیں۔“

پاک پٹن کا دورہ اور پیر سید مہر علی کی دعوت:

پاک پٹن موجودہ پاکستان کے صوبۂ پنجاب میں ہے، یہاں مشہور صوفی بزرگ بابا فرید الدین مسعود گنج شکر[ولادت:۱۱۷۳ء مطابق ۵۸۹ھ-وصال ۱۲۶۵ء مطابق ۶۶۲ھ]کا مزار ہے۔گولڑہ شریف اسلام آباد کے نواحی میں واقع ہے،یہاں مولانا پیر سید مہر علی شاہ[ولادت:۴ اپریل ۱۸۵۹ء-وفات: ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء]کا مزار ہے۔پیر سید مہر علی شاہ سلسلہ عالیہ چشتیہ کے ایک عظیم روحانی بزرگ تھے۔بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے ہم عصر تھے، دونوں کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔بڑے حضرت کچھوچھوی جب پاک پٹن تشریف لے گئے، پیر سید مہر علی شاہ نے دعوت پیش کی۔پاک پٹن سے گولڑہ شریف کا فاصلہ ۵۰۰ کیلومٹر کے قریب ہے۔ذرائع حمل ونقل کی کمی کے باوجود آپ ان کی دعوت پر تشریف لے گئے۔مولانا مفتی محمود احمد رفاقتی نے لکھا ہے:

”حضرت اشرف الاولیا[بڑے حضرت کچھوچھوی]نے پاک پٹن بھی حاضری دی،وہاں سے مولانا پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی کی دعوت خاص پر گولڑہ تشریف لے گئے،یہاں پندرہ دن قیام رہا،حضرت پیر صاحب گولڑوی نے بہت اعزاز واکرام سے نوازا اور رخصت فرمایا۔“

رنگون کا طویل سفر:

رنگون برما کا سب سے بڑا شہر ہے، اہم تجارتی اور ثقافتی مرکز ہے۔یہ شہر ۱۷۵۳ء میں برما کا دارالسلطنت بنا۔۱۸۴۲ میں انگریزوں کے زیر تسلط رہا۔آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر[ولادت:۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء-وفات:۷ نومبر ۱۸۶۲ ء] یہیں مدفون ہیں۔ان کو انگریز حکومت نے تاحیات جلاوطن کر دیا تھا۔

بڑے حضرت سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی کا سفر رنگون، برما طویل تھا۔نصف سال آپ نے وہاں قیام فرمایا، دعوت وتبلیغ کا بڑا کام کیا، دین وسنت کو عام کیا۔یہ وہ دور تھا جب آج کی طرح مواصلاتی نظام نہیں تھا۔ایام گزرتے گئے، کچھوچھہ شریف میں آپ کے تعلق سے تشویش بڑھتی گئی۔کوئی خبر آئی نہ کوئی تار آیا۔اعلی حضرت اشرفی میاں کچھوچھوی پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی، اور اسی کیفیت میں آپ نے تین ”ادھے“ کہے۔

تحائف اشرفی میں ہے:

”یہ ادھے اس وقت کہے گئے جب حضرت مخدومی ومرشدی حاجی سید ابو احمد اشرف حسین مدظلہ العالی رنگون تشریف لے گئے تھے۔“

پہلا ادھا:

چھائے رہے کونے دیش بلم مورے
کونے دیپ میں ڈھونڈن جاؤں
کر کے جوگنیا کا بھیس بلم مورے
چھائے رہے
پاتی پتر کچھ نہیں آوا
نہ کوؤ لاوا سندیس بلم مورے
چھائے رہے
روئے روئے ارداس کرت ہے
کھولے اشرفی کیس بلم مورے
چھائے رہے

اعلی حضرت اشرفی میاں علیہ الرحمہ نے اضطرابی کیفیت میں تین ادھے کہے ہیں،اور تینوں ادھے درد بھرے انداز میں کہے ہیں۔ پہلے "ادھے"ہی سے آپ کی قلبی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔[۴۰]

بڑے حضرت کچھوچھوی اور خانقاہ صفویہ خادمیہ، صفی پور:

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو جماعتی شیرازہ بندی کا خوب خیال تھا۔اس باب میں ان کا اقدام بھی باکمال تھا۔وہ ملک عزیز میں پھیلی خانقاہوں سے راہ ورسم رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ان خانقاہوں کے سالانہ تقریبات میں شرکت کرتے تھے۔جو شخص ان کے روزنامچوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرے گا وہ ہماری باتوں کی تصدیق کرے گا۔ہم یہاں بطور مثال صرف صفی پور،اناؤ کی خانقاہ صفویہ خادمیہ کا ذکر کر رہے ہیں۔

مخدوم شاہ محمد خادم صفی محمدی صفی پوری [م:۱۲۷۸ھ] سے کون واقف نہیں؟ وہ اس خانقاہ معلی کے مجدد تھے۔انہوں نے عمر کی ۵۸ بہاریں دیکھیں، اوران بہاروں میں چمن ریاضات و عبادات میں لالہ ویاسمین، گلاب ونسترن جیسے بے شمار پھول کھلائے۔ اپنی خانقاہ کو ذکر الٰہی اور شغل باطنی سے ایسا معطر کیا کہ ہر وابستۂ دامن خوشبودار ہوگیا۔"نغمۂ طریقت" اور" مخزن الولایت والجمال" ان کے ملفوظات کے مجموعے ہیں۔ اعلی حضرت اشرفی میاں کچھوچھوی نے اس برکت نشاں خانقاہ سے خلافت واجازت پائی ہے۔

کچھوچھوی سادات اور صفی پوری مشائخ کے تعلقات گہرے تھے۔رنگ چشتی میں رنگے تھے۔بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ، خلیفۂ حضرت مخدوم خادم صفی پوری حضرت علامہ سید یعقوب علیہ الرحمہ کے قدرداں تھے۔ان کے عرس میں جایا کرتے تھے۔انہوں نے اپنے روزنامچہ میں حضرت سید محمد یعقوب علیہ الرحمہ کے عرس مقدس میں حاضری کو قلم بند فرمایا ہے، چناں چہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

"پنج ذی الحجہ شب سہ شنبہ ۱۳۰۵ھ نماز مغرب وعشاء بخدمت شاہ خلیل احمد صفی پور ادا کردم و طعام دعوت عرس سید محمد یعقوب شاہ مرحوم خلیفہ حضرت شاہ خادم صفی قدس سرہ ہمراہ شاہ خلیل احمد صاحب خوردم۔"

منگل کی رات ۵؍ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ کو نماز مغرب وعشا شاہ خلیل احمد صفی پوری کے ساتھ ادا کی اوران ہی کے ساتھ شاہ سید محمد یعقوب خلیفۂ حضرت شاہ خادم صفی قدس سرہ کی دعوت عرس کا کھانا کھایا۔

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے اس موقع پر حضرت جمال الاولیاء صفی پور شریف کی شان میں ایک منقبت بھی تحریر فرمائی تھی۔ روزنامچہ میں یہ منقبت بھی درج ہے۔

عرس کا اختتام ہوا،کام تمام ہوا،صاحب عرس کا فیض عام ہوا۔اب فرصت کے لمحات تھے،فیض رسانی کے اوقات تھے،بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ اور شاہ خلیل احمد صفی پوری آفتاب وماہتاب تھے۔قرب وجوار،اطراف واکناف، گاؤں ودیہات ان کی ضیا پاشیوں سے منور ہوگئے۔ایک طویل تبلیغی دورہ تھا۔گم گشتگان راہ ضلالت کے لیے سنہرا موقع تھا۔ان بزرگوں نے اپنا فیض بانٹا،سمیٹنے والوں نے بھر بھر کر سمیٹا۔ ان علاقوں میں تبلیغی دوروں کے احوال وکوائف کی تفصیلات روزنامچہ میں مندرج ہیں۔[۴۱]

بڑے حضرت کچھوچھوی اور مولانا آل احمد محدث پھلواروی:

مولانا آل احمد محدث ہندی پھلواروی[ولادت:۷ رمضان ۱۲۲۳ھ وفات:۲۶ رمضان ۱۲۹۵ھ] مولانا احمد پھلواروی کے تلمیذ رشید تھے۔مسجد نبوی میں درسگاہ حدیث کے مسند نشیں تھے،شیخ الاسلام سید احمد زینی دحلان مکی[م:۱۳۰۴ھ]سے سند حدیث حاصل تھی اور مولانا ہدایت اللہ رام پوری [م:۱۳۲۶ھ]نے مولانا آل احمد محدث پھلواروی سے سند حدیث حاصل کی تھی۔پہلی بار ۱۲۴۲ھ میں حرمین پہنچے،تین سال قیام فرمایا۔پھر بلاد دنیا کا سفر کرتے ہوئے ۱۲۷۲ھ تا ۱۲۸۵ھ مسجد نبوی میں درس حدیث دیتے رہے پھر ہندوستان وارد ہوئے اور چند سالوں کے بعد حرمین واپس گئے۔۱۲۹۵ھ میں وصال ہوا،جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

آپ حب رسول ﷺ میں وارفتہ تھے۔سرور کائنات ﷺ نے آپ کے سر پر دست مبارک پھیرا تھا۔انگشتہائے مبارکہ کے لمس کا احساس زندگی بھر رہا اور اتنے حصے کا بال کبھی نہیں کٹایا۔باطنی فیوض و برکات کے منبع تھے۔آثار مشائخ کے مرکز تھے۔روحانی ترقی منتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ان کی روحانیت کا حال مولانا الشاہ علی حسین اشرفی میاں کچھوچھوی سے سنئے،آپ لکھتے ہیں:

”حضرت مولانا آل احمد محدث ہندی،آپ کا مسکن پھلواری شریف میں تھا۔آپ حضرت شاہ نعمت اللہ ولی پھلواری کی اولاد سے تھے،جن کا نسب خاندان جعفری الزینبی تھا۔جب آپ نے وطن میں تحصیل علوم سے فراغت پائی اور دستار فضیلت آپ کے سر پر بندھی،وطن میں چندے درس علمی دیتے رہے اور مجردانہ زندگی بسر کی۔چالیس برس سن میں مدینہ منورہ زاد اللہ شرفا و تعظیما حاضر ہوئے۔وہاں بھی مسجد نبوی ﷺ میں حدیث کا درس دیتے رہے۔اسی اثنائے قیام دربار نبوی میں آپ اولیائے اہل خدمت کے زمرہ میں داخل ہوئے۔ابرار و اخیار،نقبا و نجبا،ابدال و اوتاد سے ترقی پاکر غوث کے داہنی طرف کے امام ہوئے۔جب بائیں طرف کا امام ترقی پاکر غوث ہوا تو آپ کو مرتبہ بائیں کے امام کا ملا،صرف ایک درجہ غوثیت کا طے کرنا باقی تھا کہ بماہ شعبان ۱۲۹۰ھ میں آپ نے شب کے وقت عالم خواب میں یہ دیکھا کہ مواجہہ شریف کے سامنے ایک چارپائی بچھی ہے،اس پر حضرت محبوب یزدانی سلطان سید اشرف جہاں گیر سمنانی قدس سرہ رونق افروز ہیں اور ایک بچہ صغیر سن ہشت سالہ بھی آپ کے ساتھ ہے اور تمام اولیائے روئے زمین مؤدب دست بستہ کھڑے ہوئے ہیں۔سب کی طرف حضرت محبوب یزدانی متوجہ ہو کر ایک ایک کو خطاب بشارت آمیز فرما رہے ہیں۔جب حضرت مولانا آل احمد محدث ہندی کی نوبت آئی تو آپ نے فرمایا کہ”آل احمد قطب الاقطاب خواہی شد“یعنی تم اولیائے روئے زمین کے سردار غوث ہوگے۔“[۴۲]

حضرت مولانا آل احمد محدث ہندی کا بظاہر یہ خواب تھا،حقیقت میں درّ نایاب تھا۔خواب کی تعبیر انہوں نے خود نکالی۔ حقیقت آشکار ہوئی کہ محبوب یزدانی کے دربار سے ”قطب الاقطاب“کا منصب ملے گا۔اسی دن سے اس مبارک دربار میں حاضری کے لیے دل بیتاب تھا،اللہ کریم نے کرم کیا،دیار ہند کی واپسی کا راستہ کھل گیا۔اشرف الصوفیا،ابو احمد سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ سے مواجہہ رسول ﷺ میں ملاقات ہوگئی۔آگے کا حال صحائف اشرفی کے الفاظ میں پڑھئے:

”اسی[یعنی محدث ہندی کے خواب دیکھنے کے]سال،حضرت پیر و مرشد حاجی الحرمین سید ابو محمد اشرف حسین زاد اللہ فیضانہ و برکاتہ واسطے حصول شرف زیارت مدینہ منورہ بعد ادائے حج حاضر ہوئے،جہاں مولانا نے حضرت محبوب یزدانی کو مواجہہ شریف کے سامنے دیکھا تھا،اسی مقام پر کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھنے لگے۔مولانا آپ کے پیچھے کھڑے تھے۔بعد ختم صلوٰۃ و سلام کے مولانا نے پوچھا کہ آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں؟کچھوچھہ شریف میں آپ کا مکان ہے؟آپ حضرت محبوب یزدانی کی اولاد میں ہیں؟آپ کے جد بھی آپ کے ساتھ ہیں؟اور آپ میرے لینے کے واسطے آئے ہیں؟

حاجی شیخ سبحان علی مرحوم مہاجر مدینہ منورہ کے گھر حضرت کا قیام تھا۔مولانا نے آکر کہا کہ:آپ میرے لینے کو آئے ہیں؟میں آپ کے ساتھ جاؤں گا،میرا قرض پانچ سو روپے ادا کر دیجئے تو میں جاؤں،حضرت خاموش رہے کہ مولانا نے فرمایا:حضرت!ہاتھ اٹھائیے اور اپنے جد کو فاتحہ پڑھ کر دعا مانگئے۔تیسرے دن مولانا ہنستے ہوئے آئے اور کہا کہ:آپ میرا قرض تو ادا کر دئے لیکن میرا اور میرے شاگرد عبد العزیز کا خرچ راہ ہندوستان تک چاہیے،اس کا بندوبست کیجئے۔حضرت دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے کا ارادہ کرتے تھے کہ حاجی شیخ سبحان علی مرحوم نے عرض کیا کہ یہ خدمت میرے ذمہ ہے،میں دونوں صاحبوں کا خرچ دوں گا۔مولانا محدث نے فرمایا کہ:اس سے پہلے حج بیت اللہ کے لیے آیا،اب حج و زیارت آستانۂ کچھوچھہ شریف کے لیے جاتا ہوں۔[۴۳]

مولانا آل احمد محدث ہندی پھلواروی کی کچھوچھہ شریف آمد ہوئی،چہل روزہ چلہ مکمل کیا۔خواب میں جس بچے کو دیکھا تھا،وہ بھی رونق آرائے عالم ہو چکا تھا۔ان کی رسم بسم اللہ خوانی ادا کی،اس طرح وہ اس بچے کے پہلے استاذ مقرر ہوئے۔مستقبل میں وہ بچہ عالم ربانی،سلطان الواعظین سے مشہور و معروف ہوا؛وہ اعلی حضرت مولانا الشاہ سید علی حسین اشرفی میاں کچھوچھوی کے شہزادے حضرت علامہ سید شاہ احمد اشرف اشرفی جیلانی تھے۔[۴۴]

اعلی حضرت فاضل بریلوی اور بڑے حضرت کچھوچھوی:

بڑے حضرت مولانا الشاہ سید اشرف حسین جیلانی کچھوچھوی، اعلی حضرت مولانا الشاہ امام احمد رضا خان فاضل بریلوی کی ولادت سے ۱۴ سال پہلے رونق آرائے جہاں ہوئے اور ان کی وفات کے بعد آٹھ سال تک دنیا کو زینت بخشتے رہے۔ گویا اعلی حضرت بریلوی کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا سب بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے زمانے میں آئے اور گئے۔ دور طالب علمی، دور علمی عروج اور دور قیادت وریاست سب آپ کی مشیخت کے زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ ایک جہاں دیدہ شیخ سے علمائے عصر کے احوال وکوائف پوشیدہ رہیں! یہ کہاں ممکن ہوتا ہے؟ چنانچہ اعلی حضرت فاضل بریلوی کی علمی ومذہبی خدمات بھی بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ سے پوشیدہ نہ رہیں، ان کی تصنیفات وتالیفات کی خبریں آپ تک برابر پہنچتی رہیں، آپ ان سے واقف بھی رہے اور انہیں مطالعہ بھی کرتے رہے۔

اعلی حضرت فاضل بریلوی اور بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے تبلیغی مشن میں یکسانیت تھی۔ دونوں بزرگ رد وہابیہ فرماتے تھے۔ اس میدان میں اعلی حضرت فاضل بریلوی کے کارنامے جگ ظاہر ہیں، محتاج بیان نہیں۔ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے بھی وہابیوں کے عقائد باطلہ کا رد اپنی زندگی کا حصہ بنالیا تھا۔ آپ جہاں تشریف لے جاتے، اپنے وعظ وبیان میں وہابیوں کی تردید فرماتے۔ چنانچہ مفتی محمود احمد قادری لکھتے ہیں:

”حضور اشرف الاولیا [بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ] نے احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ بھی پورے انہماک سے انجام دیا۔ آپ کے زمانے میں مولوی اسماعیل دہلوی کی بدنام زمانہ [کتاب] تقویۃ الایمان کا زور ہوا۔ فرنگی محل، شاہ جہان پور، رام پور، بدایوں، بریلی کے علما اس کے رد پر مستعد ہوئے۔ حضرت کچھوچھہ مقدسہ میں آپ کی ذات گرامی نے وہابیت کی بلا کو دور رکھا۔“[۴۵]

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے وہابی فتنہ کی سرکوبی کے لیے قلمی رد بھی فرمایا ہے۔ حیات مخدوم الاولیا میں ہے کہ:

”حضرت اشرف الاولیا قدس سرہ نے نجدی فتنہ کے پرآشوب دور میں نجدی وہابیوں کے عقائد کے بطلان میں ایک مسلسل مضامین شروع کیا جو دار العلم والعمل حضرت فرنگی محل کے ماہنامہ ”النظامیہ“ میں مسلسل چھپا کیا اور نظر ثانی کے بعد محضر جہاں گیری کے نام سے کتابی شکل میں چھپا۔“[۴۶]

اعلی حضرت فاضل بریلوی کی کتابوں کی تائید:

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو مطالعۂ کتب کا بڑا شوق تھا۔ ان کے مطالعہ میں عقائد وسلوک اور فقہ وتاریخ کی کتابیں خصوصی طور پر رہا کرتی تھیں۔ کتابوں کے مطالعہ کے بعد آپ حاصل مطالعہ بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کی زیادہ تر تحریریں مولانا سید ظفر مسعود ابن مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی کے یہاں آج بھی موجود ہیں۔ بڑے حضرت کچھوچھوی نے اعلی حضرت فاضل بریلوی کی کتابوں کا بھی مطالعہ فرمایا تھا۔ چنانچہ جب اعلی حضرت فاضل بریلوی کی کتاب ”الکوکبۃ الشہابیہ“ فرقۂ اسماعلیہ کے رد میں چھپ کر آئی تو آپ نے نہ صرف اس کا مطالعہ فرمایا بلکہ اس کی تائید وتوثیق فرمائی، اور اپنے مریدین کو مطالعہ کرنے کی تلقین بھی فرمائی۔ مخدوم الاولیا میں ہے کہ:

”فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان علیہ الرحمہ کی کتاب ”الکوکبۃ الشہابیۃ“ جب ردعقائد اسماعلیہ چھپ کر آئی، حضرت اشرف الاولیا نے اس کی تائید وتحسین فرمائی اور اپنے شجرۂ عالیہ میں مریدوں کو آگاہ فرمایا اور فرمان جاری فرمایا کہ مولانا احمد رضا علامۂ بریلی نے اس کتاب میں پچھتر وجوہ سے اسماعیل دہلوی کا کفر اور کفریات ثابت کیا ہے، قابل مطالعہ کتاب ہے، اس کو مطالعہ میں رکھنا چاہیے۔“[۴۷]

اعلی حضرت فاضل بریلوی کے شاگردوں کی کتابوں کی تائید:

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ جس طرح اعلی حضرت فاضل بریلوی کی کتابوں پر اعتماد کرتے تھے، اسی طرح آپ کے شاگردوں کی کتابوں پر بھی بھروسہ کرتے تھے۔ ان کتابوں کو خود پڑھتے اور پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے، چناں چہ جب صدر الشریعہ تلمیذ اعلی حضرت کی کتاب ”بہار شریعت“ منظر عام پر آئی تو آپ نے اپنے مریدوں کو اس کے مطالعہ کی تاکید فرمائی۔ آپ نے اپنے شجرۂ عالیہ اشرفیہ میں لکھا کہ:

”مولوی امجد علی مفتی الہند نے بہار شریعت نام سے فقہ حنفی کے مفتی بہ مسائل کو مرتب کیا ہے، اس کو مطالعہ میں رکھنا چاہیے۔ بے مثل دینی خزینہ ہے۔“[۴۸]

تصنیفات وتالیفات:

بڑے حضرت کچھوچھوی صاحب قلم وقرطاس بزرگ تھے۔ آپ کی علمی یادگاروں میں:

[۱] انوار اشرفی: منظوم سوانح حضرت مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی۔

[۲] محضر جہانگیری: یہ رسالہ وہابیوں کے عقائد کے بطلان میں مضامین کی شکل میں لکھا گیا، بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔

[۳]رسالہ فاتحہ۔

[۴]متعدد ضخیم جلدوں پر مشتمل روزنامچہ۔

انوار اشرفی:

"انوارِ اشرفی" اشرف الاولیاء، اشرف الصوفیاء، ابواحمد سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی شاہکار تخلیق ہے، آپ کی الہامی شعر گوئی کی منہ بولتی تصویر ہے، نشانِ فضل رب قدیر ہے، آپ کے حصے کی لوح تقدیر ہے۔ پوری کتاب عمدہ لب ولہجے میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کا عنوان سیرت مخدوم سید اشرف جہاں گیر ہے، یعنی یہ کتاب حضرت سید اشرف جہاں گیر کی سوانحی دستاویز ہے، ان کے سفر وحضر کی داستان ہے، ان کے کشف وکرامات اور عبادات وریاضات کا تذکرہ ہے۔

اس کتاب کے اندر مخدوم سید اشرف جہاں گیر کے مرشد گرامی مخدوم العالم شیخ عمر علاء الحق پنڈوی علیہ الرحمہ کے کچھ شمائل وفضائل بھی حیطۂ تحریر میں لائے گئے ہیں، اور ان کے دیگر شیوخ اجازت وخلافت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے خلفائے کرام کے اسمائے گرامی بھی شامل کئے گئے ہیں، اور بہت سے ایسے شہروں اور جگہوں کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی کچھوچھوی علیہ الرحمہ کا قدم پڑا ہے۔ حاجی الحرمین شیخ عبد الرزاق نور العین اور ان کے اولاد واحفاد کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

بعض اشعار پر حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔ حاشیہ میں تاریخی وجغرافیائی کیفیات کا بیان ہے۔ حواشی کے مطالعے سے قاری کو یقین کامل ہو جاتا ہے کہ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ تحقیقی مزاج رکھتے تھے۔ کسی بات پر شک وشبہ ہوتا تو جانکاروں سے رابطہ کرتے تھے۔ مخدوم بہار شیخ یحیٰ منیری علیہ الرحمہ کی نماز جنازہ کے تعلق سے انہوں نے مولانا الشاہ شیخ امین احمد فردوسی کو مراسلہ لکھا تھا، حضرت مولانا فردوسی نے جواب مراسلہ دیا تھا، بسط وتفصیل کے ساتھ مراسلہ وجواب مراسلہ زینت کتاب ہے۔ مکمل کتاب کم وبیش ۱۵۰۰ اشعار پر مشتمل ہے، نہایت صاف اور شستہ لب ولہجہ اور برجستگی وسہل گوئی کا مرقع ہے۔ خلیفۂ اعلی حضرت اشرفی میاں کچھوچھوی حضرت مولانا رستم علی آگرہ نے درست فرمایا تھا کہ: "یہ کلام شان عارفانہ ہے۔"

مفتی محمود احمد رفاقتی لکھتے ہیں:

"روزنامچہ میں ہے کہ حضرت شاہ اکبر داناپوری ابوالعلائی خانقاہ شاہ ٹولی داناپور ضلع پٹنہ کے مشہور بزرگ متولد ۱۲۶۰ھ متوفی ۱۳۲۷ھ نے انوار اشرفی ملاحظہ فرمائی تو مشورہ دیا کہ شعری وفنی حیثیت سے بھی اشعار پر نظر ثانی ہو جاتی تو بہتر تھا۔ حضرت اشرف الاولیا [بڑے حضرت] نے اس مشورہ کو قبول فرمایا۔ حضرت اشرف الاولیا کا قیام اعلی حضرت قدسی منزلت مخدوم الاولیا [اشرفی میاں] کے ممتاز ترین خلیفۂ مجاز اور آگرہ کے نامور رئیس اور درویش عالم اور عارف حضرت نواب رستم علی صاحب کے محل سرا میں تھا، انہوں نے اشعار پر نظر ثانی کا ذکر سن کر ناپسند کیا اور عرض کیا کہ ایسے منظوم کلاموں پر اصلاح کی ضرورت نہیں، یہ کلام جو شان عارفانہ ہے۔ اصل منظوم ۱۳۱۰ھ میں طبع ہو کر مقبول انام ہوا۔" [۴۹]

انوار اشرفی کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ مطبع مجتبائی سے بھی شائع ہوا ہے۔ ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ اشرفی پریس، ٹانڈہ کا شائع کردہ ہے۔ اس میں لکھا ہے: "انوار اشرفی یعنی خلاصہ لطائف اشرفی مؤلفہ ابواحمد حاجی سید اشرف حسین صاحب اشرفی جیلانی بار چہارم طبع ہوئی۔"

محضر جہاں گیر:

وہابیت توحید کے نام پر عرب سے آئی، نام خوب صورت اور لبادہ مثل مورت تھا، اس کے دام تزویر میں سادہ مسلمان پھنستے چلے گئے۔ وہابیت کی کوکھ سے دیوبندیت نے جنم لیا، یعنی یہ دیوبندیت در اصل وہابیت ہی کی ایک زہریلی شاخ ہے۔ اس دیوبندیت نے بہت تیزی کے ساتھ اپنے بال وپر نکالے، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر گھر میں اس کے اثرات پہنچ گئے۔ صورت حال کی خوفناکی کے پیش نظر جلیل القدر علما ومشائخ نے بھی دیوبندیت کے زہریلے اثرات کو کم کرنے کے لئے میدان عمل میں قدم رکھ دیا۔ اعلی حضرت الشاہ امام احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمہ نے جب محسوس کیا کہ اس شاخ بد کا سایہ شہر ودیہات ہر سمت پھیلتا جا رہا ہے، علاقوں کے علاقے متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں، تو انہوں نے شب وروز اس پر کام کیا اور اپنے کام کا دائرہ عجم تا عرب پھیلایا۔ کچھوچھہ شریف کی سرزمین پر اشرف الصوفیا بڑے حضرت کچھوچھوی اور اعلی حضرت مولانا الشاہ سید محمد علی حسین اشرفی میاں علیہما الرحمہ نے کمان سنبھالی اور گاؤں دیہات، قصبہ وشہر ہر جگہ دعوت وارشاد کے ساتھ وہابیت کا رد کیا۔ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے قلمی میدان میں بھی قدم رکھا اور دار العلم والعمل فرنگی محل سے شائع ہونے والے ماہنامہ "النظامیہ" میں مستقل کالم چھپوانا شروع کیا۔ مولانا مفتی محمود احمد رفاقتی لکھتے ہیں:

"حضرت اشرف الاولیا [بڑے حضرت کچھوچھوی] قدس سرہ نے نجدی فتنہ کے پر آشوب دور میں نجدی وہابیوں کے عقائد کے بطلان میں ایک مسلسل مضامین شروع کیا تھا جو دار العلم والعمل فرنگی محل کے ماہنامہ "النظامیہ" میں مسلسل چھپا کیا اور نظر ثانی کے بعد محضر جہاں گیر کے نام سے کتابی شکل

میں چھپا۔"[۵۰]

"محضر جہاں گیر" کتاب کا تاریخی نام ہے، اور بنارس کے اہل عقیدت کی فرمائش پر گلدستہ مضامین کو کتابی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ عنوان ایک باتیں انیک۔ ابتدا میں اماکن اہل سنت کی فہرست، پھر واعظین اہل سنت کے اسماء و پتے، پھر مدارس اہل سنت کے نام و پتے۔ مولوی پنڈت بہاری کا خط، وہابیوں کی کتب اور ان کی حقیقت، اور پھر کتب وہابیہ کی تردید میں اہل سنت کی جانب سے لکھی جانے والی کتابوں کی فہرست جیسے اہم موضوعات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد رسالے کی ابتدا ہے۔ اصل کتاب کی ابتدا بعد خطبہ ان سطور سے ہوتی ہے:

"فقیر ابو محمد اشرف حسین ابن حضرت حاجی سید شاہ سعادت علی ابن حضرت سید شاہ قلندر بخش سجادہ نشیں اشرفی الجیلانی متوطن اشرف پور کچھوچھہ ضلع فیض آباد اپنے برداران اسلام سنی حنفی کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ بوجہ عدم واقفیت حالات مندرجہ کتب علمائے دین اکثر لوگ دھوکے میں آجاتے ہیں اور حق و ناحق کی تمیز کرنے میں مشکل پڑتی ہے، بلحاظ خیر خواہی برادران اسلام پرچہ النظامیہ کی نقل طبع کرا کے شائع کرتا ہوں۔"[۵۱]

ماہنامہ "النظامیہ" مئی ۱۹۱۶ء اور اس کے بعد کے شماروں میں شائع شدہ مضامین کا اندراج ص:۱۹ سے ہوتا ہے۔ ان قسط وار مضامین کا موضوع رد وہابیت ہے، مواد دلائل و براہین سے مزین ہے اور بلاشبہ صاحب تحریر کی علمی جودت اور لسانی سلاست کا ایک جیتا جاگتا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ پیش کش عمدہ اور گفتگو سلیقہ دار ہے۔

کتاب کے آخر میں خانوادۂ اشرفیہ کے عظیم شعرائے کرام کے کچھ قصائد و کلام بھی موجود ہیں۔ ان سارے کلاموں کا معیار بہت اونچا اور بلند ہے۔ ہمارے سامنے کتاب کا جو نسخہ ہے وہ مطبع مجتبائی سے چھپا ہوا ہے۔ کتاب کی یہ پہلی اشاعت ہے۔

روزنامچہ:

روزانہ کے تجربات و مشاہدات کو کسی کاپی میں لکھ لینا "روزنامچہ" کہلاتا ہے۔ روزنامچہ میں تاریخ کا اندراج بھی ہوتا ہے، یہ آپ بیتی ہی کی ایک قسم ہے، سوانح عمری مرتب کرنے کے لیے روزنامچہ عمدہ مواد ہے۔ روزنامچے میں مصنف شب و روز کے معمولات، قلبی جذبات اور ذہنی احساسات لکھتا ہے۔ اس سے مصنف کی زمینی مصروفیات کا علم ہوتا ہے اور متعلقہ عہد کے معاشرتی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، ادبی اور لسانی پہلوؤں کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ روزنامچہ نگار کی حیثیت چشم دید گواہ کی ہوتی ہے جو حالات و واقعات کو من و عن بیان کرتا ہے۔ دنیا میں چند روزنامچے ہی مشہور ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں غالباً بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کا روزنامچہ سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ طویل ہے۔ اس کے اندراج کے بارے میں مفتی محمود احمد رفاقتی لکھتے ہیں:

"حضرت اشرف الاولیا [بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ] کے تصنیفی کارناموں میں روزنامچہ کی ضخیم تیرہ جلدیں بھی ہیں، علم و حکمت اور خاندانی وقائع اور سیرت و سیاحت کا خزینہ ہیں، مگر ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ اس میں خاندان اور علاقہ و دیار کے امرا و رؤسا، علما و مشائخ اور اعزہ و اقارب کے بارے میں گفتگو بھی ہے۔ اعزہ و اقارب اور علما و مشائخ کی تاریخ ولادت و وفات بھی ہے، مخالفین و معاندین و اعداء کی طرف سے ایذا رسانیوں کی داستان اندوہگیں بھی ہے۔ والدین کریمین کے سانحۂ وفات پر نالہ و اندوہ و رنج بھی ہے۔ مریدین و متوسلین کا تذکرہ بھی ہے، سفر حج و زیارت کا بیان بھی ہے، غرض کہ وہ سب کچھ ہے جس کا ذکر لازمۂ روزنامچہ ہے، ان روزنامچوں کو سامنے رکھ کر حضرت اشرف الاولیا [بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ] کی مستند سیرت و سوانح لکھی جا سکتی ہے۔ راقم الحروف ۱۳۰۱ھ تا نہم جمادی الاولی ۱۳۴۶ کی تیرہ جلدوں کے مطالعہ کا شرف حاصل کر چکا ہے، نہم جمادی الاخری ۱۳۴۷ھ کے روزنامچہ میں آخری وصیت نامہ تحریر فرما کر روزنامچہ لکھنا بند فرما دیا، آخر میں تحریر فرمایا: "میں نے نشانات لگا دئے ہیں، گیارہ جلدیں سوانح کی ہیں اور تین جلدیں خوابوں کے بیان ہیں۔"

حضرت مفتی محمود احمد رفاقتی علیہ الرحمہ نے روزنامچہ کے جلدوں کی تعداد تیرہ لکھی ہے۔ جب کہ انہوں نے خود روزنامچہ نگار کا بیان نقل کیا کہ: "گیارہ جلدیں سوانح کی ہیں اور تین جلدیں خوابوں کے بیان ہیں" جس کا مجموعہ چودہ ہوتا ہے۔ روزنامچہ کا جو عکس ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی صدر شعبۂ عربی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد کے پاس ہے وہ ۶۰ ساٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مختار اشرف لائبریری، جامع اشرف، کچھوچھہ شریف میں اسکالرز کے مطالعہ کے لیے مہیا کی گئی جلدوں کی تعداد غالباً ۴۷ ہے۔ خاندان کے بہت سے سادات کرام سے میں نے سنا ہے کہ روزنامچہ کی کل جلدیں ساٹھ ہیں۔ حضرت علامہ مفتی محمود احمد رفاقتی نے جن جلدوں کا مطالعہ کیا ہے، انہوں نے ان ہی جلدوں کی تعداد لکھی ہے۔ انہوں نے لکھا کہ: "راقم الحروف ۱۳۰۱ھ تا نہم جمادی الاولی ۱۳۴۶ء کی تیرہ جلدوں کے مطالعہ کا شرف حاصل کر چکا ہے۔"

رسالہ فاتحہ:

یہ رسالہ فاتحہ کے جواز وعدم جواز سے بحث کرتا ہے۔یہ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی مستقل تصنیف نہیں ہے، بلکہ چند سوالات اور ان کے جوابات ہیں۔انہوں نے مفتیان کرام سے جواز وعدم جواز فاتحہ کے تعلق سے استفتا کیا تھا۔مفتیان کرام نے فاتحہ کے جائز ہونے کے فتاوی دیئے،انہوں نے استفتا کے ساتھ ان فتاوی کو شائع کر دیا۔رسالہ کے سر ورق پر لکھا ہے:

”الحمد للہ خلاصۂ کتاب رسالۂ فاتحہ چند استفتائے ضروری–مولانا سید شاہ ابو المحمود اشرف حسین صاحب اشرفی جیلانی دام برکاتہ۔“

پھر لکھا ہے:

”حسب فرمائش جناب معلی القاب سید شاہ ابو المحمود اشرف حسین صاحب نے طبع کرائی،موضع کچھوچھہ شریف،ضلع فیض آباد معرفت جناب مولانا محی الدین اشرف صاحب،جناب گلزار شاہ صاحب۔“

وقت کے جلیل القدر مفتیان کرام کے جوابات اور عظیم ارباب فتوی کی تصدیقات سے مزین یہ رسالہ جواز فاتحہ پر کافی ووافی اور نافع وشافی ہے۔منکرین فاتحہ کے لیے لمحۂ فکریہ اور نصیحت نافعہ ہے۔رسالے کا سال اشاعت ۱۳۳۰ھ ہے اور ”دی مغل پرنٹنگ پریس“،قندھاری بازار، لکھنو سے شائع ہوا ہے۔

اس مختصر رسالے میں بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی ساری تصنیفات وتالیفات کا احاطہ نہیں کیا جاسکا۔ان کی کچھ کتابیں پردہ خفا میں ہیں۔مفتی محمود احمد لکھتے ہیں:

”حضرت اقدس اشرف الاولیا[بڑے حضرت کچھوچھوی]علیہ الرحمہ اپنے معمولات وعبادات کے بعد کتب عقائد وسلوک اور فقہ وتاریخ کا خصوصی مطالعہ فرماتے تھے۔اور بیاض خاص میں حاصل مطالعہ بھی تحریر فرماتے تھے۔بہت سی اہم کتابیں آج بھی آپ کے فرزند اصغر حضرت مولانا سید مظفر حسین صاحب قبلہ کے گھر میں آپ کی نقل کی ہوئی موجود ہیں۔“

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”حضرت اشرف الاولیا[بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ]نے خود بھی اپنے پیر ومرشد اور نانا حضرت شاہ نیاز اشرف کی سیرت وسوانح اور فضائل وکرامات میں بزبان فارسی منظوم لکھے تھے،مگر اس کی طباعت نہیں ہوئی اور اب یہ کن کے پاس ہے اس کا علم نہیں ہوسکا۔“[۵۲]

بڑے حضرت کچھوچھوی کی تاریخ گوئی اور شاعری:

مفتی محمود احمد رفاقتی لکھتے ہیں:

”حضرت اشرف الاولیا،شیخ الشیوخ مولانا حاجی سید شاہ اشرف حسین صاحب شعر گوئی سے بھی شغف رکھتے تھے،کلام میں سرشاری اور سرمستی ہے،بہت سا کلام منظوم فرمایا ہوگا اور بہت سی تاریخیں کہی ہوں گی۔تاریخیں تو بہت سی روزنامچہ میں محفوظ ہیں مگر کلام اس میں مندرج نہیں،اگر کسی بیاض میں ہوگی[ہوگا]تو اس کا علم نہیں ہوسکا کہ کہاں اور کس کے پاس ہے۔انوار اشرفی اور اسرار اشرفی میں اردو فارسی کا کلام شامل ہے۔“

اشرف الاولیا بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی شاعری اور تاریخ گوئی پر ہم الگ الگ مختصراً کلام کریں گے۔

تاریخ گوئی:

فنِ تاریخ گوئی کسی شعر، مصرع یا نثر کے حروف ابجد سے کسی واقعہ کی تاریخ کا برآمد کرنا ہے۔یہ روایت اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی ہے۔جو تاریخی شعر یا مصرع برآمد ہوا اسے مادہ یا مادۂ تاریخ کہا جاتا ہے۔عربی،فارسی اور اردو میں یہ روایت صدیوں سے جاری ہے مگر اب اس کا رواج اردو میں کم ہوتا جارہا ہے۔تاریخ گوئی انہی زبانوں میں رائج ہے جو عربی حروف تہجی میں لکھی جاتی ہیں۔ولادت،شادی،وفات،کتابوں کی تصنیف،بادشاہوں کی تخت نشینی، فتوحات، خطاب یابی، منصب پر ماموریت اور عمارت کی تعمیر وغیرہ کے لیے مادۂ تاریخ نکالنے کا رواج چند دہائیوں پہلے عام سی بات تھی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس فن کی اہمیت کیا ہے؟دراصل اس فن کا بڑا مقصد اہم واقعات کے سال کو محفوظ رکھنا ہے۔

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں تاریخی مادے لکھے ہیں۔یہ مادے صرف تاریخ یا سال کی نمائندگی نہیں کرتے،اس میں نفس واقعہ کا آئینہ بھی ہوتا ہے۔ان مادوں میں صرف شخص کی تاریخ ولادت ووفات نہیں ہوتی بلکہ ان میں شخصیت کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور اس کے فضائل وشمائل کا اشاریہ بھی ہوتا ہے۔بڑے حضرت کی تاریخ نویسی کی یہ ایک بڑی خصوصیت ہے۔

فارسی تاریخی مادوں کے چند نمونے:

شعیب الاولیاء شاہ محمد یار علی [ولادت: ۱۲ فروری ۱۹۰۰ء-وفات: ۱۵ مارچ ۱۹۶۷ء] ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ تھے، ان کو قطب الاقطاب حضرت شاہ عبد اللطیف علیہ الرحمہ ستھنی نے سلسلہ چشتیہ کی اجازت وخلافت سے نوازا تھا۔ جب قطب الاقطاب شاہ ستھنی علیہ الرحمہ کا وصال ہوا تو بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے ان کی تاریخ وفات یوں کہی:

شاہ عبد اللطیف گشت رواں
زیں سپنجی سرائے سوئے جناں
در نہم ماہ جمادی الاول
جست تاریخش اشرف جیلاں
بردر خلد چوں رسید لطیف
بیام غفور بگفتہ رضواں

۱۳۳۹ھ

شاہ عبد اللطیف اس دنیا سے جانب جنت نویں جمادی الاولیٰ کو روانہ ہوئے۔ اشرف جیلانی نے اس طرح تاریخ نکالی۔ جب شاہ عبد اللطیف خلد پہنچے رضواں نے کہا "بیا مغفور" ۱۳۳۹ = [بخشش دئے گئے ہیں، آجایئے]

دیگر مادئہ تاریخ وفات شاہ عبد اللطیف ستھنی علیہ الرحمہ:

شیخ وقت عارف کامل یکتا
شاہ عبد اللطیف اہل ولا
بہ نہم ماہ جمادی الاول
زیں جہاں رفت سوئے جناں
گفتم ایں مصرعۂ تاریخ اشرف
رحمۃ للہ بروخش حفا

۱۳۳۹ھ

اہل محبت، بے مثال شیخ وقت، عارف کامل شاہ عبد اللطیف نویں جمادی الاولیٰ کو اس دنیا سے سوئے جنت گئے، اشرف نے مادۂ تاریخ "رحمۃ للہ" ۱۳۳۹ = ھ" کہا ہے۔

عارف کامل شاہ الٰہی بخش چشتی جون پوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت مولانا شاہ کامل ولید پوری کے مرید وخلیفہ تھے۔ بڑے پایے کے بزرگ تھے۔ مولانا شبلی نعمانی کے والد ان ہی کے مرید تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے خوب صورت مصرعۂ تاریخ لکھا:

شد الٰہی شاہ چوں واصل بحق
بہرہ گو معرفت از ذکر حق
بست وپنجم از جمادی الآخریں
پیرا جنت نمودہ مردحق
حسب فرمائش ولی اللہ شاہ
اشرفا! تاریخ گو "منظور حق" ۱۳۰۴ھ

الٰہی شاہ جب واصل حق ہوئے، ذکر حق سے معرفت حق تک پہنچے۔ ۲۵/ جمادی الآخرہ کو پیر نے ایک مرد حق کو جنت دکھایا، شاہ ولی اللہ کی فرمائش پر اشرف نے مادئہ تاریخ "منظور حق" نکالا۔

دیگر مصرعۂ تاریخ وفات حضرت الٰہی شاہ جون پوری رحمۃ اللہ علیہ:

چوں الٰہی شاہ ازحکم قضائے
رفت زیں عالم سوئے دار البقائے
از جمادی الاخریٰ آمدبست وپنج
یوم دوشنبہ زلطف کبریائے
مصرعہ تاریخ گفت اشرف حسین
نقش بندی قادری جنت جزائے

۱۳۰۴ھ

الٰہی شاہ جب قضائے الٰہی اور اللہ کریم کی مہربانی سے ۲۵؍ جمادی الآخرہ یوم دوشنبہ کو اس دنیا سے دار البقا کو سدھارے، اشرف حسین نے مصرع تاریخ "نقش بندی قادری جنت جزائے" لکھا۔

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ تاریخ نویسی میں فقید المثال تھے-انہوں نے اپنی تصنیف "انوار اشرفی اور "روزنامچہ" میں اس کی بہترین مثالیں یادگار چھوڑی ہیں۔ان کی تاریخ گوئی میں جو برجستگی نظر آتی ہے وہ دوسری جگہ بمشکل ملتی ہے۔ان کی تاریخ گوئی میں شخصیت کے خدوخال اور حسن وکمال بہتر انداز میں نمایاں نظر آتے ہیں۔مادۂ تاریخ شخصیت کے فضل وکمال کو ظاہر کرتا ہے اور دین داری ودنیاداری کی پہچان کراتا ہے۔وہ اپنے نانا سید شاہ نیاز اشرف اشرفی جیلانی علیہ الرحمہ کے وصال پر لکھتے ہیں:

نیاز اشرف شہ من زیں جہاں رفت
پئے سیر جناں مسرور و دلشاد
نمودم فکر اشرف بہر تاریخ
گلے خیرات بہ رضوان نداداد

۱۲۷۸ھ

میرے شاہ نیاز اشرف جنت کی سیر کے لیے مسرور وشاد ہوکر اس جہان سے رخصت ہوگئے،فکر اشرف سے مصرع تاریخ "گلے خیرات بہ رضوان نداداد" ظاہر ہوا۔

اردو تاریخی مادوں کے چند نمونے:

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں کمال حاصل تھا۔ان کے جمال تحریر سے ان کے کمال صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے۔ان دونوں زبانوں پر ان کی یکساں قابلیت کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی صلاحیت کا لسانی ترجمان فارسی ہے یا اردو؟پیرایۂ بیان دونوں زبانوں میں تقریباً برابر ہے۔لہجہ لکنت سے پاک اور زبان شستہ اور صاف ہے۔ذیل میں دیئے گئے چند تاریخی مادے ومصرعے اس کے شاہد ہیں۔

اسرار اشرفی کے مؤلف حضرت سید شاہ حمایت اشرف اشرفی جیلانی علیہ الرحمہ کے وصال پر بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے والہانہ تاریخ کہی ہے۔تاریخ گوئی کے ساتھ سیرت نگاری کی چاشنی بھی نمایاں ہے:

سید وشاہ حمایت اشرف
جب گئے یاں سے سوئے داربقا
حب احمد کے تھے دریامیں غرق
آل واصحاب پہ سوجان سے فدا
سولھویں ماہ ربیع اول
پیرکادن بھی واہ خوب ملا
کہی اشرف نے معاً یہ تاریخ
داخل خلد حبیب آج ہوا ۱۳۰۷ھ

اعلی حضرت مولانا الشاہ سید علی حسین اشرفی کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے ہم زلف حضرت مولانا سید شاہ غفور اشرف اشرفی جیلانی علیہ الرحمہ کا وصال ہوا تو سارا خاندان غم واندوہ میں ڈوب گیا۔ اس موقع پر بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے بزبان اردو تاریخی مادہ لکھا۔ تاریخی مادے سے وقت وفات کے حالات نمایاں ہیں۔ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی تاریخ گوئی کا یہی کمال ہے کہ شخصیت آشکار ہوتی ہے اور کوائف واحوال بھی وا ہو جاتے ہیں۔

تھی چھٹی ماہ جمادی الآخر
یوم شنبہ تھا اے صاحب کیش
چھوڑ فرزند وزن بیکس کو
گئے دنیا سے غفور اشرف دیش
ایسی حالت پر سب ہوئے نالاں
پئے تاریخ غشی آئے پیش

یہ محض ”مشتے نمونے از خروارے“ ہیں، بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی تاریخ گوئی پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ان کی شاہکار تصنیف ”انوار اشرفی“ اور ”روزنامچہ“ میں ان کے تاریخی مادوں اور مصرعوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

شاعری:

کسی انسان کی خوبیوں کا بیان اگر اس کی حیات میں کیا جائے تو یہ مدح کہلاتا ہے، اور اگر اس کے اوصاف ومناقب کا ذکر اس کی وفات کے بعد کیا جائے تو یہ مرثیہ کہلاتا ہے، تاہم رسول اکرم ﷺ کی ذات محترم اس قاعدے سے مستثنیٰ ہے؛ کیوں کہ آپ ﷺ انسان کامل ہیں، بشری صفات کے اعلیٰ ترین نمونے اور ارفع ترین شبیہ ہیں۔ آپ ﷺ کی حیات اور وفات دونوں برابر ہیں۔ بنابریں رسول اللہ ﷺ کے وصال مبارک کے بعد اگر کسی خوش نصیب کو مدح خیر الانام ﷺ کی توفیق عطا ہوتی ہے تو یہ مدح سرائی ”نعت“ کہلائے گی۔

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی نعت گوئی کا مرکزی موضوع رسول اللہ ﷺ کی ذات و متعلقات ہے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات وپیغامات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ مقاصد نبوت وبعثت نبوی کو بھی لفظوں میں پرو دیا ہے۔ ان کی نعت گوئی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اصلاحی اور مقصد انسانی کے پہلو کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ حق یہ ہے کہ ان کی وسعت فکر سے صنف نعت کو وسعت ملی ہے۔

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے کلام ان کی تصنیفات وتالیفات اور روزنامچہ میں منتشر ملتے ہیں۔ انہوں نے شاید اپنے کلام کو بذات خود یکجا کرنے کا اہتمام نہیں کیا اور ان کے بعد کسی اور نے بھی اس کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح سے ان کی نعتیہ شاعری کا کوئی مجموعہ تیار نہیں ہو سکا۔ انوار اشرفی ان کی مطبوعہ تصنیف ہے، اس میں بہت سی نعتیں، تاریخی مادے اور قطعات وغیرہ اشاعت پا چکے ہیں۔

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کلام کہے ہیں، زیادہ تر کلام اردو میں ہیں، دونوں زبانوں میں آپ کو یکساں کمال حاصل تھا۔ سلاست، روانی اور برجستگی ہر دو زبان کے کلام میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اشعار میں نثر کا لطف بھی مترشح ہے۔

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کی تصنیفات اور روزنامچوں کو کھنگالا جائے تو ایک مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ اس مختصر تحریر میں جملہ کلام کی شمولیت مشکل ہے۔ بطور نمونہ چند کلام قارئین باذوق کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

فارسی کلام کے نمونے:

اے خاص محبوب خدا، بنگر سوے احوال من
بہ نگر بچشم لطف خود، منگر سوے افعال من
من عاصیم یا مصطفے، تو بادشاہ انبیا
کن رحم یا خیر الورا، یا شافع افعال من
تو فخر مخلوق خدا، از باعثت شد ماسوا
اے شافع روز جزا، اے دافع اشکال من
کن مشکلم آسان نبی، بنما جمال سرمدی

کن دردلم جلوہ گری،اے شاہ خوش اقبال من
اشرف غلام کوے تو،مشتاق دیدروے تو
ہردم بہ جستجوے تو،اے شاہد خوش حال من

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے یہ کلام دربار مدینہ منورہ میں ۱۲۹۱ھ میں بطور عرضی پیش کیا تھا۔[۵۳]

پائے کوباں رقصم ،اندرعشق ختم المرسلین
نعرہابردارم ازپادشہ دنیا ودین
حب او بے خود نمودہ جن وانس وطیررا
عالمے آشفتہ مثل ویس خیر التابعین
شدنباتات وجمادات عاشق آں بے نظیر
گشتہ ماہ دوپارہ چوں کردہ اشارت مہ جبین
کل شئ یرجع آمد بہ اصل خویشتن
اونبودے من نمی بودم،نہ ایں عرش برین
آمدہ حب الوطن ایمان خاصان خدا
درمکانت اشرفا باشدمکین آں شاہدین[۵۴]

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے نعت کے علاوہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اوراولیائے عظام کے مناقب بھی لکھے ہیں۔غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانی،مخدوم العالم شیخ علاء الحق پنڈوی،غوث العالم مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی،شیخ الشیوخ فرید الدین مسعود گنج شکراور غازی اسلام سید سالار مسعود غازی وغیرہم علیہم الرحمہ پرآپ کی شاندار منقبتیں ہیں۔بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو اولیائے کرام سے خصوصی لگاؤ تھا،اور وہ ان کے فیوض وبرکات کو سرمایۂ حیات سمجھتے تھے۔انہوں نے اولیائے کرام سے اپنی عقیدت ومحبت کااظہار ان اشعار میں کیاہے:

من غلام خاکپایم باجمال اولیا
مفلس ومسکین گدایم باجمال اولیا
انت ہادی انت مقبول جناب کبریا
من سراسر برخطایم باجمال اولیا
بخش ماراتاج دولت حب ختم المرسلین
تازعصیاں بازآیم باجمال اولیا
غرق دریاے محبت مشت خاکم چوں شود
درخودی ہرگز نہ آیم باجمال اولیا
اشرف مسکین ہمیں خواہد کہ درروز نشور
مست ومخمورانہ آیم باجمال اولیا

اردوکلام کے نمونے:

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے فارسی سے زیادہ اردومیں شاعری کی ہے۔ان کی اردوشاعری کئی صنف کلام کومحیط ہے۔سب سے زیادہ حمد ومدح،نعت ومناقب اور غزلوں پرمشتمل کلام نظر آتے ہیں۔نظم،مخمس،مسدس،رباعی،قطعات وغیرہ اصناف سخن میں بھی ان کے بہترین طبع زادکلام موجودہیں۔نعتیہ شاعری ان کی اردوشاعری کابہترین حصہ ہے۔سامان لطف کی خاطر چنداشعارپیش خدمت ہیں:

گوعشق میں کامل نہیں،دم بھرتے ہیں پر دم بدم
جاناترے قال نہیں،دم بھرتے ہیں پر دم بدم
جاں بازشمع رخ پہ ہوں،پروانہ ساہر لحظہ میں

مہجور ہوں، واصل نہیں، دم بھرتے ہیں پر دم بدم
اپنی تمنا وصل ہے، مرضی میں پر کیا دخل ہے
اعمال کا عامل نہیں، دم بھرتے ہیں پر دم بدم
اشرف کہوں تو کیا کہوں، بہتر یہی ہے چپ رہو
خود رفتوں میں شامل نہیں، دم بھرتے ہیں دم بدم

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے بعض کلام ایسے ہیں جن سے آپ کی ذات کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔فکر آخرت، متاع دنیا سے نفرت عیاں ہوتی ہے۔ عاجزی وانکساری، دین شناسی وخداترسی ظاہر ہوتی ہے۔ وعظ و نصیحت اور پند و موعظت کا سلیقہ آشکارا ہوتا ہے۔ عمر کے تراسیویں پڑاؤ پر کہا گیا یہ کلام ملاحظ کریں:

بڑا تردد ہے اے برادر، بھنور میں غم کے پڑا ہوں ششدر
نہیں یہ معلوم کیسا گذرے گا حال، پیش خدائے داور
ہمیشہ کی ہم نے عیش وعشرت، رہے گرفتار خواب غفلت
نفیس پوشش وخورش کی خواہش، سوا نہ تھا میرے دل کے اندر
پڑھی تھی گرچہ نماز رسمی، نہیں تھا جس میں حضور اصلاً
بھروسے ایسی شکستہ کشتی کے، پار جاویں گے کس طرح پر
رکھا جو روزہ تو ہائے غفلت، صرف آب وطعام روکا
تمام اعضا سے کی گناہیں، یہ روزہ ہوگا قبول کیوں کر
گئے جو عرفات پر عزیزو تو بہر نام و نمود اپنے
خیال تھا کہ کہیں گے حاجی، نہ مقصد طاعت رب اکبر
الہی توبہ! الہی توبہ! نہیں ہوئی مجھ سے تیری طاعت
گناہ سب بخش دے ہمارے، طفیل احمد شفیع محشر
اب عمر ہشتاد و سہ ہے، گذری بہت گئی، تھوڑے دن ہیں باقی
خدایا اشرف کو دے بصیرت کہ دیکھے تیرا وہ نورانور

اسی نوعیت کے چند اشعار مزید ملاحظہ کریں:

گئی جو طفلی تو موجود شباب ہوا
مطیع نفس کا ہو خانہ خراب ہوا
جوانی بھی گئی اب آئے انحطاط کے دن
یہ ضعف عیش ومسرت کا سدباب ہوا
جواب مجھ کو دیا آکے میری ہمت نے
میں پست ہمتی اپنے سے لاجواب ہوا
جو وقت یاد الہی تھا گذرا غفلت میں
ہے طفلی اور جوانی کا عہد خواب ہوا
جسے سمجھتے تھے بحر عظیم لاحاصل
وہ تھوڑی دیر میں صرصر زدہ حباب ہوا
وہ سرو باغ امید اپنا سبزاور شاداب
شگفتہ ہو کے پھر اک دم میں بانقاب ہوا

عصا کا ہاتھ سے جانا غضب ہے پیری میں
کسی کو ٹھوکریں کھانے کو انقلاب ہوا
نحیف اشرف نالاں کی دستگیری ہوئی
کروں میں شکرادا ذرئہ آفتاب ہوا

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے نعتیہ غزلیں بھی کہی ہیں،ان غزلوں کے بعض اشعار دل کو تڑپادیتے ہیں اور خون کو گرمادیتے ہیں۔ تپش شوق اور سوز عشق ان کی اس صنف شاعری کا خصوصی حصہ ہے۔اشعار میں سادگی وصفائی کے ساتھ ایک قسم کی شگفتگی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔حسن دل پذیر اور لذت تاثیر کا قاری کے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

حج وزیارت اور رسول اللہ ﷺ کا دیدار:

اشرف الصوفیا سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی معروف بہ بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کا شمار ان ہستیوں میں ہوتا ہے جن کو ماتھے کی آنکھوں سے رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ مولانا مفتی محمود احمد رفاقتی لکھتے ہیں:

"حضور پرنور اشرف الاولیا[بڑے حضرت]قدس سرہ کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ انہوں نے اپنے والد ماجد کو حج کرایااور حج وزیارت کے ساتھ خدمت گزاری کی سعادت بھی حاصل فرمائی۔ تین بار حج وزیارت کا شرف حاصل ہوا۔ حضور پرنور قدسی منزلت مخدوم الاولیا[اعلی حضرت اشرفی میاں] قدس سرہ نے بیان فرمایاکہ مدینہ منورہ میں بوقت حاضری چشم سر سے آپ کو حضور ﷺ کا دیدار حاصل ہوا۔عالم مدینہ حضرت مولانا آل احمد محدث دربار رسالت میں آپ کا اعزاز واحترام دیکھ کر گرویدہ ہوئے اور آپ کی معیت میں کچھوچھا شریف حاضر ہوئے۔"[۵۵]

بڑے حضرت مولانا سید شاہ اشرف حسین کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے غالبا پہلا حج ۱۲۹۰ھ میں ادا فرمایا۔اسی سفر حج میں انہوں نے محدث پھلواروی مولانا آل احمد مدنی سے ملاقات کی اور وہ ان کے ہمراہ مدینہ منورہ سے چل کر کچھوچھہ مقدسہ وارد ہوئے۔اس حج کی کچھ تفصیلات انہوں نے خود اپنے قلم سے کچھ یوں تحریر کی ہیں:

"یہ فقیر اشرف حسین ۱۲۹۰ھ کو بماہ شوال کعبہ شریف سے روانہ مدینہ منورہ کو ہوا۔تین روز کی روٹی بازار کی کام آئی،چوتھے روز تردد ہوا کہ میں نے کھانا نہیں پکایا،کیا ہوگا،بروح حضرت محبوب یزدانی فاتحہ پڑھااور عرض کیا کہ دادا ہم کو کھانا پکانا ہوگا،صبح کو محمد شاہ دہلوی نے مجھ سے کہا:تنہا کھانا پکاؤ گے؟ سامان ہم کو دو۔آٹا،دال،گھی،شکر وغیرہ ان کے حوالے کردیا اور آٹھ روزے میرے رمضان شریف کے جہاز پر قضا ہوئے تھے،اس سفر میں ادا کردیا،اس قدر آرام ملا۔مدینہ منورہ میں مولانا آل احمد محدث پھلواروی مجھ سے بہ محبت وعقیدت ملے اور فرمایاکہ میں نے فلاں تاریخ کو خواب میں دیکھاکہ مخدوم سید اشرف جہاں گیر قدس سرہ اپنے پوتے ہشت سالہ کو لے کر آئے ہیں،چارپائی پر مسجد نبوی میں مخدوم صاحب اور بوریا پر میں اور حضرت کا پوتا ہے،پھر میری طرف اشارہ کیا،فرمایا:ہاتھ بڑھاؤ،میں نے ہاتھ دراز کیا،لعاب دہن ہاتھ پر عنایت فرماکر ارشاد فرمایاکہ:توقطب ہوگا۔اس فقیر اشرف حسین نے جو تاریخ خواب مولانا کو حساب کیا تو میرے فاتحہ پڑھنے کی تاریخ تھی،پھر مولانا صاحب نے میرے ہمراہ حج کیا،پھر درگاہ کچھوچھہ شریف میں آکر عرصہ تک قیام کر کے سفر ہندوستان چار سال تک کر کے مدینہ منورہ میں ۱۲۹۴ھ میں انتقال فرمایا۔"[۵۶]

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کا غالبا یہ پہلا حج تھا،دوسرا حج آپ نے اپنے والد گرامی حضرت مولانا سید شاہ سعادت علی اشرفی جیلانی کے ہمراہ ادا فرمایا۔اس حج کا سال ۱۲۹۲ھ تھا،اسی سفر حج میں در رسول اکرم ﷺ میں آپ کے والد گرامی علیہ الرحمہ نے آپ کو خلافت واجازت سے سرفراز کیا۔ مفتی محمود احمد رفاقتی نے لکھا ہے:

"[مولانا سید سعادت علی اشرفی جیلانی نے]۱۲۹۲ میں حج وزیارت کا شرف حاصل کیا،مدینہ منورہ میں ۱۲۹۳ھ کو فرزند اکبر حضرت اشرف الاولیا[بڑے حضرت کچھوچھوی]کو خلافت واجازت خاندانی سے سرفراز فرمایا۔"[۵۷]

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کو کس حج میں دیدار رسول اکرم ﷺ کا شرف حاصل ہوا؟اس کی تفصیل غالباً روزنامچہ میں درج ہوگی۔مفتی محمود احمد رفاقتی نے روزنامچہ کا مطالعہ کیا تھا،اسی مطالعہ کی روشنی میں انہوں نے لکھا ہوگا۔روزنامچہ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے۔اعلی حضرت مولانا الشاہ علی حسین اشرفی میاں علیہ الرحمہ نے ایک شعر میں اس واقعہ کو پرویاہے،سند کے لیے یہی کافی ہے۔

سہ سفر حج نمود ،چوں مدینہ رسید
دید نبی راعیاں حاجی اشرف حسین

خلفاء و مریدین:

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے ہزاروں مریدین تھے۔ان میں علماوصلحا کی تعداد بھی کافی تھی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خانوادۂ اشرفیہ کے تقریباہر خورد وکلاں کے شیخ آپ ہی تھے۔آپ کے خلفاء کی تعداد کا حتمی علم تونہیں ہے تاہم بعض اہم خلفا کے نام یہ ہیں:

[۱]اعلی حضرت مولانا الشاہ سید علی حسین اشرفی جیلانی۔

[۲]مولانا الشاہ سید حمایت اشرف اشرفی جیلانی۔

[۳]مولانا الشاہ سید عزیز اشرف اشرفی جیلانی۔

[۴]مولانا الشاہ سید حضور اشرف اشرفی جیلانی جائسی۔

[۵]مولانا الشاہ سید محی الدین اشرف اشرفی جیلانی معروف بہ اچھے میاں۔

[۶]مولانا شاہ منیر اشرف،ضلع باڑہ سیری۔

[۷]مولانا سید عبد اللہ عالی کول۔

ازواج و اولاد:

بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے دو نکاح ہوئے۔پہلے نکاح سے ایک فرزند مولانا الشاہ سید جعفر اشرف اشرفی جیلانی اور ایک دختر کی ولادت ہوئی۔ دوسرے نکاح سے دو صاحب زادی اور چند فرزندگان کی ولادت ہوئی،سب نے انتقال کیا،سب سے چھوٹے فرزند مولانا الشاہ سید مظفر حسین اشرفی جیلانی تھے۔یہاں دونوں شہزادوں کا تعارف بہتر معلوم ہوتا ہے:

فرزند اکبر-سید شاہ جعفر اشرف:

مولانا سید شاہ جعفر اشرف اشرفی جیلانی کی ولادت ۱۲۸۳ھ میں ہوئی، اپنے چچازاد بھائی حضرت شاہ احمد شرف کے ساتھ کانپور استاذ زمن شاہ احمد حسن فاضل کانپوری[م:۱۳۲۲ھ]کی خدمت میں بھیجے گئے،انہی کے پاس درسیات کی تکمیل کی۔جامع معقول ومنقول تھے۔علم میں پختہ اور اخلاق میں عمدہ تھے۔کم عمری میں بڑی مقبولیت پائی۔عمر کی چوبیس بہاریں دیکھی تھیں کہ ہند کے اکناف واطراف میں چرچے ہونے لگے تھے۔ایک بار اپنے چچا اعلی حضرت مولانا الشاہ علی حسین اشرفی جیلانی کے ہمراہ ایک تبلیغی دورے پر سکندر آباد گئے،وہیں ۱۳۰۸ھ میں ان کا وصال ہوا۔ مولانا الشاہ سید محی الدین اشرف اشرفی جیلانی معروف بہ اچھے میاں[۱۳۰۸-۱۳۸۶ھ]،آپ کے فرزند اور جانشین ہوئے۔

فرزند اصغر-مجاہد دوراں سید شاہ مظفر حسین کچھوچھوی:

مولانا سید شاہ مظفر حسین کی ولادت ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ درس نظامیہ کی متوسط تعلیم کچھوچھہ مقدسہ میں حضرت مفتی عبد الرشید اشرفی ناگپوری ومفتی احمد یار خاں اشرفی نعیمی[م:۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء] سے حاصل کی۔اس کے بعد شیخ الجامعہ مفتی عبد الرشید اشرفی ناگپوری نے آپ کو صدر الافاضل سید نعیم الدین محدث مرادآبادی[م:۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء] کی درسگاہ میں پہنچادیا،جہاں رہ کر دورۂ حدیث کیا اور تعلیم مکمل فرمائی۔ اپنے چچا اعلی حضرت علی حسین اشرفی میاں سے بیعت وارادت رکھتے تھے اور انھی سے آپ کو اجازت وخلافت بھی تھی۔ مولانا سید شاہ مظفر حسین اشرفی جیلانی علم وعمل میں یکتا تھے،ان سے دینی وملی بڑے بڑے کارنامے انجام پائے۔علمی پایہ بہت بلند تھا اور سیاسی غلغلہ دور تک پہنچا ہوا تھا۔مذہبی وسیاسی دونوں حلقوں میں آپ کو مقبولیت حاصل تھی۔حکمراں طبقے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے،اور مجاہد دوراں جیسے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔آپ کی ذات سے مسلمانوں کے بہت سے مسائل حل ہوئے۔دینی جلسوں میں آپ کا طوطی بولتا تھا۔جس اسٹیج پر آپ پہنچ جاتے،کامیابی کی ضمانت مانی جاتی۔آپ نے ملک بھر میں نہ جانے کتنے ہی اداروں کی بنیاد رکھی اور کتنے ہی اداروں کو پروان چڑھایا ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

دار العلوم وارثیہ [گومتی نگر،لکھنؤ]،دار العلوم اسحاقیہ [جودھپور، راجستھان]،دار العلوم گلشن طیبہ [مندسور، مدھیہ پردیش]، دار العلوم اہل سنت اسلامیہ حنفیہ [ضلع گنگانگر،راجستھان]،دار العلوم اشرف العلوم [پورا گوہر ،سلطان پور،یوپی]،دار العلوم اشرفیہ معین العلوم[گونڈہ، یوپی]،دار العلوم رضویہ برکاتیہ[چھبرامؤ ضلع قنوج۔یوپی]،دار العلوم شاہ عالم[احمد آباد، گجرات]،دار العلوم مدینۃ العلوم[چار توڑا قبرستان، احمد آباد، گجرات]۔

۱۹۶۲ء میں مولانا سید شاہ مظفر حسین اشرفی جیلانی نے مراد آباد سے لوک سبھا کا الیکشن لڑا،خود فرمایا کرتے تھے کہ:”مراد آباد سے الیکشن لڑنے کے لیے بہت پہلے سے ہی حضور صدر الافاضل علیہ الرحمہ میری ذہن سازی کر چکے تھے اور ان کے روحانی تصرفات اور کرم کے ذریعہ ہی میں اس الیکشن میں کامیاب ہوا۔“پھر ۱۹۸۰ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر بہرائچ شریف سے لوک سبھا کا الیکشن لڑا اور کامیاب ہوئے۔ حق بولنے والوں کو اکثر حکام وقت کا

معتوب ہونا پڑتا ہے۔ حضرت مجاہد دوراں بھی ایک حق گو، بے باک اور نڈر قائد تھے۔ نہ آپ کبھی کوئی مصلحت پالتے اور نہ کسی حاکم وقت اور نہ کسی ظالم وجابر کو خاطر میں لاتے اسی لیے آپ کو بارہا جیل جانا پڑا۔ ۱۹۴۹ء میں بابری مسجد میں مورتیاں رکھ دینے پر آپ نے فیض آباد میں زبردست احتجاج کیا جس کے نتیجے میں آپ کو گرفتار کرلیا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں کلکتہ فسادات کے موقع پر مظلوموں کی امداد کرنے اور ان کی آواز بلند کرنے کے پاداش میں عید سے ایک دن قبل گھر سے گرفتار کر لیے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کوٹے کی حق میں بولنے، مسٹر چھاگلہ کو ایوان میں حقیقت کا آئینہ دکھانے اور حکومت کی غلط پالیسی پر سخت تنقید کرنے کے سبب فیروز شاہ روڈ دہلی سے آپ کو وقتی طور پر گرفتار کیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں باسودیو مرڈر کیس کے سلسلے میں آپ کو گرفتار کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں نس بندی کے مسئلے کو لے کر حکومت کے خلاف کھڑے ہونے کی جرم میں آپ کو گرفتار کیا گیا۔ ۱۹۸۶ء سے بابری مسجد کا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا اور آپ کی تمام تر توجہ بابری مسجد کی حفاظت اور بازیابی پر مرکوز ہوگئی۔

مجاہد دوراں کا وصال ۹ رجب ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۹۹۷ء کو ہوا۔ فرزندوں میں سید محفوظ الرحمان اشرفی جیلانی، سید مشرف حسین اشرفی جیلانی اور مولانا سید ظفر مسعود اشرفی جیلانی ہوئے۔ آخر الذکر جانشین ہوئے، امسال ۱۴۴۳ھ/ ۲۰۲۲ء آپ کا وصال ہوا۔

وصال پُر ملال:

بڑے حضرت اشرف الصوفیا سید شاہ اشرف حسین اشرفی جیلانی کو لمبی عمر ملی-۲۵ محرم ۱۳۴۸ھ بمطابق ۳ جولائی ۱۹۲۹ء کو وصال ہوا۔ اعلی حضرت اشرفی میاں نے نماز جنازہ پڑھائی-رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ درگاہ معلی کے خاندانی خطیرہ میں قبر منور زیارت گاہ خلائق ہے۔[۵۸]

آپ کے وصال پُر ملال سے کچھوچھہ مقدسہ میں سوگ کا ماحول چھا گیا، ہر طرف غم والم نے ڈیرا ڈال لیا۔ اپنے پرایے سبھی مغموم ہوئے۔ اہل خاندان پر تو گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ حاسدوں اور دشمنوں نے بھی کلمۂ ترجیع پڑھا، تعزیت پیش کی۔ اعلی حضرت اشرفی میاں علیہ الرحمہ سب سے زیادہ غمگین تھے۔ وہ آپ کے بھائی تھے، مرشد تھے اور مربی ومسند نشیں تھے۔ اس موقع پر آپ نے ایک شاندار رثائی نظم لکھی[۵۹]، جس میں ان کے شمائل وفضائل کا ذکر کیا، جو یہاں پیش کرنا مناسب ہے:

سرور اہل زماں حاجی اشرف حسین
سید عالی مکاں حاجی اشرف حسین
واقف سرنہاں حاجی اشرف حسین
کامل باعز وشاں حاجی اشرف حسین
چوں بتوجہ نظر اشرف عالم نواخت
گشت عزیز جہاں حاجی اشرف حسین
سلسلہ اشرفی یافت اشاعت ازو
رہبر گم گشتگاں حاجی اشرف حسین
زینت سجادہ ومسند شاہ حسن
مرجع انس وجان حاجی اشرف حسین
برسر منبر نشست وعظ ونصائح نمود
عارف شیریں بیاں حاجی اشرف حسین
پیر نیاز اشرفی تاج خلافت نہاد
برسر شیخ زماں حاجی اشرف حسین
سہ سفر حج نمود چوں مدینہ رسید
دید نبی راعیاں حاجی اشرف حسین
عزوکرامات او حاسد بدبیں ندید
بود ولی بے گماں حاجی اشرف حسین
بود خدا حافظش از ضرر دشمناں

ماند بامن واماں حاجی اشرف حسین
چوں سفر آخرت آمدہ پیش رفت
ذکر کناں اززباں حاجی اشرف حسین
اشرفی بے نوا صاحب سجادہ کرد
از کرم بیکراں حاجی اشرف حسین

حوالہ جات:

۱-حیات مخدوم الاولیامحبوب ربانی، محمود احمد قادری،ناشر :حضرت امین شریعت ٹرسٹ ،اسلام آباد ،سون برسا، مظفر پور، سال اشاعت:۱۴۲۱ھ/۲۰۰۱ء؛ص:۶۸،۶۷۔
۲- مرجع سابق؛ص:۵۹ ۔
۳- مرجع سابق،نفس صفحہ۔
۴- انوار اشرفی،حاجی سید اشرف حسین اشرفی جیلانی،مطبع اشرفی، ٹانڈہ،فیض آباد، بار چہارم؛ ص:۵۳۔
۵-حیات مخدوم الاولیامحبوب ربانی؛ص: ۵۲ ۔
۶- انوار اشرفی،حاجی سید اشرف حسین اشرفی جیلانی،مطبع اشرفی، ٹانڈہ،فیض آباد، بار چہارم؛ ص:۵۲۔
۷-تفصیل دیکھئے:اسرار اشرفی،سیدشاہ حمایت اشرف اشرفی جیلانی/سید شاہ عزیزاشرف اشرفی جیلانی، مشمولہ انوار اشرفی،مطبع اشرفی، ٹانڈہ،فیض آباد، بار چہارم؛ ص:۵۴ تا۶۴۔
۸-صحائف اشرفی،علامہ سید شاہ محمد علی حسین اشرفی میاں، ناشر ادارہ فیضان اشرف دارالعلوم محمدیہ، باؤلامسجد، ممبئی، سال اشاعت:۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء،ج:۲؛ص:۱۸۵،۱۸۴۔
۹-مرجع سابق؛ص:۱۶۴۔
۱۰-حیات مخدوم الاولیامحبوب ربانی، محمود احمد قادری،ناشر حضرت امین شریعت ٹرسٹ ،اسلام آباد ،سون برسا، مظفر پور، سال اشاعت :۱۴۲۱ھ/۲۰۰۱ء؛ص: ۵۳۔
۱۱-شیخ نظام یمنی،لطائف اشرفی فی بیان طوائف صوفی:مکتبہ سمنانی ،فردوس کالونی، کراچی، پاکستان، طبع دوم:شوال المکرم۱۴۱۹ھ/فروری۱۹۹۹ء؛ج:۲؛ص:۹۵۔
۱۲- حیات مخدوم الاولیامحبوب ربانی؛ص:۵۳۔
۱۳-مرجع سابق؛ص:۵۴۔
۱۴-تحائف اشرفی،نعتیہ دیوان اعلی حضرت اشرفی،مقدمہ،سید غلام بھیک نیرنگ،مطبوعہ بلالی سٹیم پریس ،ساڈھورہ،انبالہ،سال اشاعت: ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء؛ص:۵۔
۱۵-سلاسل کی تفصیل کے لیے دیکھئے:سیرت اشرفی،مولاناطیبب الدین اشرفی۔ مطبوعہ رضاآفسیٹ پریس، ممبئی، ص:۵-۱۷؛ شجرۂ اشرفیہ-جاری کردہ خانقاہ سرکار کلاں۔
۱۶-تحائف اشرفی،نعتیہ دیوان اعلی حضرت اشرفی،مقدمہ،سید غلام بھیک نیرنگ،مطبوعہ بلالی سٹیم پریس ،ساڈھورہ،انبالہ،سال اشاعت: ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء؛ص:۷،۶۔
۱۷- مخدوم الاولیامحبوب ربانی؛ص:۴۹، ملخصاً۔
۱۸-دیکھئے:روزنامچہ مؤرخہ ۱۳صفر ۱۳۰۷ھ بحوالہ حیات مخدوم الاولیا؛ص:۵۱،۵۰۔
۱۹-دیکھئے:حیات مخدوم الاولیا؛ص:۵۵،۵۴۔
۲۰-تحائف اشرفیہ،سید شاہ غفور اشرف،مطبع فیض عام،علی گڑھ،سال اشاعت نیافتم؛ص:۲۰۔
۲۱- تحائف اشرفیہ،سید شاہ غفور اشرف،مطبع فیض عام،علی گڑھ،سال اشاعت نیافتم؛ص:۲۱۔
۲۲-وظائف اشرفی،حضرت اشرفی میاں کچھوچھوی،حق اکیڈمی ،مبارک پور،اعظم گڑھ،ص:۵۰۔
۲۳-دیکھئے:حیات مخدوم الاولیا؛ص:۸۶۔
۲۴- حیاتمخدوم الاولیامحبوب ربانی؛ص:۵۹۔
۲۵-دیکھئے: روزنامچہ ۷اشوال ۱۳۰۱ھ بحوالہ حیات مخدوم الاولیا؛ص:۶۹۔
۲۶-دیکھئے :حیات مخدوم الاولیا؛ص:۷۱،۷۰۔
۲۷-ماہنامہ اشرفی،ج:۱،ماہ جنوری ۱۹۲۳ء،ضمیمہ :برکات چشتیہ؛ص:۴،۳۔
۲۸-دیکھئے: حیات مخدوم الاولیا؛ص:۷۱،۷۰۔
۲۹-مرجع سابق؛ص:۵۴،۵۳۔
۳۰-استاذ العلما مولانامفتی لطف اللہ علی گڑھی، نواب محمد حبیب الرحمن شروانی، مکتبہ قادریہ ،لاہور،تاریخ اشاعت: رجب ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء؛ص:۷۔
۳۱-دیکھئے:تذکرۂ مولانا سید احمد اشرف کچھوچھوی، رضاء الحق اشرفی راج محلّی،ناشر الاشرف اکیڈمی ،راج محل،ضلع صاحب گنج، بہار،سال اشاعت:۱۹۹۵ء؛ص:۱۵۔
۳۲- حیات مخدوم الاولیامحبوب ربانی؛ص:۶۱،۶۰-مقتبساً۔
۳۳-مرجع سابق،نفس صفحہ۔
۳۴-مرجع سابق نفس صفحہ۔

۳۵-صحائف اشرفی،علامہ سید شاہ محمد علی حسین اشرفی میاں، ناشر: ادارہ فیضان اشرف دارالعلوم محمدیہ، باؤلا مسجد، ممبئی، سال اشاعت: ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء;ج:۲;ص: ۱۶۹،۱۶۸۔
۳۶-دیکھئے:حیات جاوید،الطاف حسین حالی،ارسلان بکس،علامہ اقبال روڈ ،میر پور، آزاد کشمیر، سال اشاعت: ۲۰۰۰ء;ص:۴۴،۴۳۔
۳۷۔مرجع سابق;ص:۶۱۔
۳۸-مرجع سابق;ص:۶۰-ملخصاً۔
۴۰-تینوں ادھوں کے لیے دیکھئے:تحائف اشرفی،سید شاہ محمد علی حسین اشرفی میاں;ص:۸۹،۸۸،۸۷۔
۴۱-دیکھئے: روز نامچہ ۱۳۰۵۔
۴۲-صحائف اشرفی;ج:۲;ص:۱۵۱۔
۴۳- مرجع سابق,نفس صفحہ۔
۴۴-دیکھئے:ماہنامہ سلطان المشائخ،لاہور،بابت ماہ جولائی،اگست ۱۹۵۵ء،بحوالہ تذکرۂ مولاناسیداحمد اشرف کچھوچھوی; ص:۱۴۔
۴۵- حیات مخدوم الاولیامحبوب ربانی;ص:۵۹۔
۴۶-مرجع سابق; ص:۶۴۔
۴۷۔نفس مرجع;ص:۵۹۔
۴۸-مرجع سابق ;ص:۶۰۔
۴۹-حیات مخدوم الاولیا;ص:۶۴۔
۵۰-مرجع سابق;نفس صفحہ۔
۵۱-رسالہ محضر جہانگیری،سید شاہ ابو محمد اشرف حسین کچھوچھوی،مطبوعہ مطبع مجتبائی ،لکھنو،سال اشاعت :ندارد;ص:۱۷۔
۵۲-مرجع سابق;ص:۶۴۔
۵۳- دیکھئے:انوار اشرفی،مرجع سابق; ص:۷۸،۷۷۔
۵۴-بڑے حضرت کچھوچھوی علیہ الرحمہ کا مذکورہ کلام انوار اشرفی کے ساتھ ماہنامہ اشرفی،ماہ جمادی الثانی:۱۳۴۱

لکھنؤ کا عیش باغ : چند تاریخی جھلکیاں

ڈاکٹر نور محمد لکھنوی

Abstract:

India is home to many ancient communities and civilizations, it has some of the oldest towns and cities known to human kind with a unique history of their own. Lukhnow is a medievel city, formed on the banks of the river Gomti, it has been the center of Indian and Islamic renaissance at different periods of time. "Aish Bagh" is one such area in this city which boosts of rich history and significance. In the recent past, it has been one of the centers of Indian freedom movement. Though, very little has been written on it and its contribution to Indian History, here in this article an attempt is made to highlight these important fatcs.

Key Words:

Indian History, Islamic History, Awadh, Lukhnow, Aish Bagh, Nawabs of Awadh, Indian Independence, Indian Freedom Movement, Indian Freedom Struggle, 1857 Independence struggle, 1947 Independence movement

لکھنؤ:

ہندوستان کے تاریخی وجود کی قدامت پر اہل تاریخ کا اتفاق ہے۔اسی طرح تاریخی دفاتر میں ہندوستان کے جن علاقوں کی قدامت مسلم ہے، ان میں اودھ کا علاقہ کافی مشہور و معروف ہے۔ لکھنؤ اسی اودھ کا ایک اہم خطہ ہے۔ تاریخ میں لکھنؤ کا سب سے پہلے ذکر ابن بطوطہ (م:۷۷۹ھ=۱۳۷۷م) کے سفرنامے میں آیا ہے۔ یہ سلطان محمد بن تغلق کے زمانہ سلطنت (۱۳۲۵-۱۳۵۱م) کی بات ہے۔اس کے علاوہ، اس اولین تاریخی بیان کے قریبی عہد کے متعدد بزرگوں کے احوال میں ضمناً لکھنؤ کا تذکرہ ملتا ہے۔مغل سلطنت کے زمانے میں لکھنؤ کی تاریخی تصویر مزید واضح ہوئی۔ اس عرصے میں لکھنؤ کا سیاسی عروج وزوال اور تہذیبی ارتقا، تاریخ ہند میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

عیش باغ اور موتی جھیل:

۱۷۰۷ میں شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد مغل سلطنت کا مرکزی نظام ضعف و اضمحلال کا شکار ہوگیا، جس کی وجہ سے ملک کے طول و عرض میں خود مختار ریاستی حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ ان خود مختار ریاستوں میں ایک اہم نام ریاست اودھ کا ہے، جس کی بنیاد برہان الملک نواب سعادت علی خان کے ذریعے ۱۷۲۲ء میں پڑی۔ابتدا میں سلطنت اودھ کا پایہ تخت فیض آباد تھا۔ محمد یحیی مرزا زمانی عرف نواب آصف الدولہ (۱۷۴۸-۱۷۹۷) کے عہد میں (۱۷۷۵-۱۷۹۷) لکھنؤ ریاست اودھ کا مرکز قرار پایا۔ اس کے بعد مسلسل اس کی تعمیر و ترقی میں اضافہ ہوتا رہا۔ عیش باغ اور موتی جھیل بھی عہد آصفی کی یادگار ہیں۔ شباب لکھنؤ میں ہے:

”---آصف الدولہ نے جو عمارتیں بنائیں ان کی صنعت تعمیر اور شوکت و عظمت آج تک بنانے والے کی نیت پر گواہی دے رہی ہیں۔ حسن باغ، عیش باغ، چار باغ کا نام ابھی تک مشہور ہے---“[۱]

سید آغا مہدی لکھنوی تحریر کرتے ہیں:

"اس باغ کی بنیاد نواب آصف الدولہ کے ہاتھ سے ہوئی اور یہ موتی جھیل کے کنارے جانب شرق تھا اور چارو طرف خوشنما اور بلند پھاٹک تھے۔ اس باغ کی شہرت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ نواب کے زمانے میں ساون کا میلہ بڑی دھوم سے ہوتا تھا۔ اودھ کے کمالات اور فنون لطیفہ کے مظاہرے، مشرقی صنعت و حرفت کے منظر، دیکھنے، خلائق کھنچ کھنچ کر آتی تھی۔ تاریخ میں ہے کہ:

"موتی جھیل کا پانی چشمہ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا ہے، پیاسوں کا دل ہراتا ہے۔" (فسانہ عجائب مولفہ رجب علی سرور)۔ اس چشمے میں اتنی گہرائی اور گنجائش تھی کہ بڑے بڑے پیرنے والے اپنی پیراکی کے جوہر دکھاتے تھے۔

سنتے ہیں موتی جھیل میں بھی پانی آگیا
تیراکیاں بھی ہونے لگیں بہر امتحاں

اس نہر کی تیاری کے بعد عیش باغ میں اور زیادہ چار چاند لگ گئے۔ آصف الدولہ کے لے پالک وزیر علی خاں کی شادی کا جلسہ عیش باغ اور چار باغ میں ہوا۔ اس وقت تمام درخت سنہری اور روپہلی بادلے سے منڈھے ہوئے تھے۔ نوابی ختم ہونے پر شاہی کا آغاز ہوا اور ہر بادشاہ نے عیش باغ کو کچھ نہ کچھ ترقی دی۔ عہد اختری کے شاعر نے اسی باغ کی مدح میں کہا ہے:

رہنا ہو لکھنؤ میں جسے جائے عیش باغ
تکلیف سیر ہم کو نہ دے یار و مہرباں
پھرتے ہیں عیش باغ میں دل باغ باغ ہے
ہر ایک سرو قد کے بغل میں ہے بوستاں

ایک شخص لکھنؤ سے کلکتہ چلا گیا۔ اس کے دوست نے جدائی کا صدمہ لکھتے ہوئے تحریر کیا کہ لکھنؤ میری نظر میں بغیر تمہارے اجڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے جواب میں لکھا:

"اگر حیات باقی ہے تو پھر وہی صحبت اور وہی باتیں اور وہی دن رات کی ملاقاتیں اور وہی شکار اور وہی عیش باغ کی سیر ہے اور مر گئے تو خاتمہ بخیر ہے۔" [۲]

آتش کہتے ہیں:

کوچہ تیرا عیش باغ اے یار بے تاویل ہے
چشم اشک آلود عاشق اس میں موتی جھیل ہے

عیش باغ کے شروع کے حصے کو نواب گنج کہتے ہیں۔ نماز عید ۱۸۵۷ء سے عید گاہ کے میدان میں ہوتی ہے۔ عید گاہ میں مسلمانوں کی نماز اور تر/ ٹر کا میلہ عیش باغ کے وہ منظر تھے جو صفحہ تاریخ پر باقی رہیں گے۔" [۳]

عیش باغ کی ابتدائی تاریخ بیان کرتے ہوئے، گوپی چند نارنگ نے عشرت لکھنوی (زمانہ، ۱۹۲۶: ص:۲۸) کے حوالے سے لکھا ہے:

"لکھنو کا یہ مشہور باغ نواب آصف الدولہ نے تعمیر کرایا تھا۔ روایت ہے کہ اس کا رقبہ شہر کانپور کے رقبے کے برابر تھا۔ نواب کو اس باغ کی تعمیر پر بڑا ناز تھا۔ ہر روز صبح کے وقت گھوڑے پر سوار ہو کر ہواخوری کو آتے تھے۔ باغ کے انتظام کے لئے ایک ہزار سات سو مالی مقرر تھے جو وہیں گمزیوں میں رہتے تھے۔ جا بجا سنگ مرمر کے کنویں بنے ہوئے تھے۔ موتی جھیل وسط باغ میں تھی جو ہمیشہ صاف شفاف پانی سے لبریز رہتی۔ جدھا نام کی ایک اور جھیل پل کے دوسری طرف تھی۔ اس کے قریب ہی کھجوا جھیل تھی جس میں اب بھی تھوڑا بہت پانی رہتا ہے۔ یحییٰ گنج کے خاتمہ پر قلق کے باغ کے پاس عیش باغ کا شکستہ پھاٹک اب بھی موجود ہے۔

سحر لکھنوی نے اس باغ کا ذکر اپنے قصیدوں میں متعدد بار کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

تصویر ہے بہشت کا نقشا ہے عیش باغ
وہ جنتی تھا جس نے بنایا ہے عیش باغ
پانی کے چشموں سے نہیں خالی کوئی جگہ
آئینہ ہر شجر کو دکھاتا ہے عیش باغ

مجنوں کی طرح مجد میں کس کی بلا رہے
دیوانے لکھنؤ کے ہیں صحرا ہے عیش باغ
لبریز موتی جھیل ہے آب حیات سے
سبزہ خضر ہے، آپ مسیحا ہے عیش باغ
پایا ہے اس زمین نے خلعت بہار سے
-کشمیر کا یہ سبز دوشالہ ہے عیش باغ
کشتی مے بھی ساتھ چلے عیش باغ میں
جمنا ہے باڑھ پر لب دریا ہے عیش باغ
بیٹھو فقیر ہو کے سحر موتی جھیل پر
تم کو پسند سب سے زیادہ ہے عیش باغ[۴]

عیش باغ کے میلے:

کتاب مذکور میں "عیش باغ کے میلے" کے عنوان سے مصنف نے تحریر کیا ہے:

"عیش باغ کے میلے کی ابتدا آصف الدولہ کے عہد میں ہوئی تھی۔"

"لوگ ساون کے چار جمعہ تک جمع ہو کر میلہ کرتے تھے۔ کچھ زمانے کے بعد جمعہ کے ساتھ ہفتہ بھی شریک ہو گیا۔ میلہ نہایت دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ ایک طرف سے امراء و روسا پیدل سوار مع رفیقوں اور خدمت گاروں کے ہوتے تھے۔ بڑے بڑے مہاجن مالدار بگھیوں پر بیٹھے ہوئے، بقال، بنئے، کنجڑے، قصائی، دھوبی، جلاہے جمع ہوتے تھے۔ دکاندار دکان لگائے دال موٹھ، مونگ جڑے پھلکیاں، دہی بڑے، کھیر کی ہانڈیاں، پونڈے کی گنڈیریاں۔۔۔ ہر چیز قرینے سے لگاتے تھے۔ کچھ جوان کچھ لڑکے جھولا درختوں میں ڈالے ساون گاتے تھے۔ مداری سانپ کی لڑائی دکھاتے تھے، ریچھ والے ریچھ لڑاتے تھے۔ بندر والے بندر سے عجیب عجیب کرتب دکھاتے تھے، نٹ اپنا تماشا کرتے تھے۔ نان بائی اپنی دکانوں میں پلاؤ قلیہ قورمہ روٹی لیئے بیٹھے تھے۔ افیونی اپنے دوست احباب کے ساتھ جمع ہو کر چسکی گھول رہے تھے۔ گنے چھیلے جاتے اور داستان سنائے جاتے۔ کھلونے والوں کی دکانوں پر لڑکوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ تنبولنیں پری پیکر پان لگا کر خریداروں کو کھلا رہی تھیں۔ ساقنیں بھاری بھاری جوڑے پہنے بناؤ سنگار کئے دھواں دھار حقے پلا رہی تھیں۔ بھنگڑنیں گانجہ چرس کی چلمیں بھر بھر کے دے رہی تھیں۔ رنڈیاں گاڑیوں پر سوار اپنی بہار دکھاتی تھیں۔ جا بجا لوگ فرش بچھائے حقہ منھ سے لگائے یار دوستوں میں بیٹھے نظر آئے تھے۔"

"اس میلے کی رنگینیوں اور دلفریبیوں کا ذکر سحر لکھنوی نے اپنے ایک قصیدے میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند شعر:

رند و بہار آگئی غائب ہوئی خزاں
جمنا بھی جامنوں کی سڑک پر ہوئی رواں
سر سبز عیش باغ ہوا دل ہرے ہوئے
ہونے لگے نکھار جہاں دیکھئے وہاں
سنتے ہیں موتی جھیل میں بھی پانی آگیا
یراکیاں بھی ہونے لگیں بہر امتحاں
کیا کیا ہوئے ہیں سرو قدوں کے بدن ہرے
چڑھتے ہیں نو رتن نہ اترتی ہیں انڈویاں
ہر کوچے میں بہار نئی ساونی کی ہے
کیا کیا درخت سینچتے پھرتے ہیں باغباں
کیا باغ عیش باغ ہے بے شک بہشت ہے
جائے کبھی بہار نہ آئے کبھی خزاں

پھرتے ہیں عیش باغ میں دل باغ باغ ہے
ہر ایک سروقد کی بغل میں ہے بوستاں
رہنا ہو لکھنؤ میں جسے جائے عیش باغ
تکلیف سیر ہم کو نہ دیں یار و مہرباں[۵]

ص:۱۵۱ حاشیہ پر فسانہ عجائب، (ص:۶) کے حوالے سے ہے:

"فسانہ عجائب میں رجب علی بیگ سرور نے اس میلے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"عیش باغ میں تماشے کا میلہ، ہر وقت چین کا جلسہ، موتی جھیل پانی چشمہ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا، پیاسوں کا دل لہراتا، سڑک کے درختوں کی فضا جدا، کھجوا موجیں مارتا، ہار سنگار کے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا۔ رنگا رنگ کی پوشاک، آپس کی جھانک تاک، آم کے درختوں میں پٹکا لگا، خاص جھولا وہیں پڑا۔ جھولنے والوں پر دل ٹپکا پڑتا۔ محبت کے پینگ بڑھتے، دیکھنے والے درود پڑھتے۔ باغ میں کوئل پپیہے مور کا شور، جھولے پر گھٹا رہی گھنگھور، ساون بھادوں کے جھالے، وہ رنگین جھولنے والے، دشت غربت میں یہ جلسہ جو یاد آتا ہے۔ دل پاش پاش ہو جاتا ہے، کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

انقلاب 1857 میں لکھنؤ کا محاذ:

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے درمیان بھی عیش باغ کا تذکرہ کتب تواریخ میں متعدد مقامات پر ملتا ہے، لیکن عیش باغ کی دبی ہوئی راکھ کریدنے سے پہلے محاذ لکھنو کا اجمالی خاکہ پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

۱-۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کی ابتداء ۷ مئی کو لکھنؤ۔۔۔(غالباً عیش باغ اور موسی باغ، جیسا کہ آگے آرہا ہے)۔۔۔سے ہوئی۔ لیکن یہ ابتدا قبل از وقت تھی۔ لکھنو کا چیف کمشنر سر ہنری لارنس (Sir Henry Montgomery Lawrence) (۲۸ جون ۱۸۰۶–۴ جولائی ۱۸۵۷ء) اس کو دبانے میں کامیاب ہو گیا۔

۲-چنہٹ کے قریب ،اسماعیل گنج (لکھنؤ) میں ۳۰ جون ۱۸۵۷ کو سید برکت احمد رسالہ دار (۱۷۸۷–۵ جون ۱۸۵۸ء) کی قیادت میں انقلابیوں اور سر ہنری لارنس کے لشکر سے معرکہ آرائی ہوئی۔ اس معرکہ آرائی میں انگریزی افواج کو پسپا ہونا پڑا اور وہ بھاگ کر ریزیڈینسی میں پناہ گزیں ہو گئیں، انقلابیوں نے ریزی–ڈینسی کا محاصرہ کر لیا۔ مچھی بھون میں بھی انگریزی فوج موجود تھی، لارنس کی ہدایت پر وہاں کے فوجی کمانڈر کرنل پامر نے رات میں ہی مچھی بھون کو بارود سے اڑا دیا اور اپنی فوجوں کے ساتھ ریزی–ڈینسی میں آگیا۔ یکم جولائی سے حریت پسندوں نے محاصرہ سخت کر دیا۔ محاصرے کے دوران ۳ جولائی کو ہنری لارنس، گولا باری سے زخمی ہونے کے بعد ۴ جولائی کو ملک عدم سدھارا۔ ہنری لارنس کی وفات کے بعد سر جان انگلس (Sir John Eardley Wilmot Inglis) (۱۸۱۴-۱۸۶۲) نے ریزی–ڈینسی میں محصور انگریزی دستے کی کمان سنبھالی اور اگلے ۸۷ دن (تقریباً تین ماہ) تک بڑی کامیابی سے دفاعی مورچہ قائم رکھا۔

۳-۶ جولائی کو حریت پسندوں نے نظم و نسق بحال کرنے کی غرض سے، بیگم حضرت محل کے ایما پر، "برجیس قدر" کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا اور شرف الدولہ نواب محمد ابراہیم خاں کو وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ بیگم حضرت محل کے جو حمایتی محاذ لکھنؤ میں سرگرم تھے، ان میں بہت سے حریت پسند، "راجہ جے لال سنگھ" (اعظم گڑھ، ۱۸۰۳–اکتوبر ۱۸۵۹، لکھنؤ) کی قیادت میں محاصرہ لکھنؤ کی کاروائی میں شامل تھے۔ یہ لوگ چنہٹ کے معرکے میں بھی شامل تھے۔ راجہ جے لال، بیگم حضرت محل کے سالار لشکر تھے اور عوام کے درمیان سے سپاہ بھرتی کا کام مولوی احمد اللہ شاہ کے ذمے تھا۔

۴-محاصرہ ابھی جاری تھا، مولوی احمد اللہ شاہ نے ریزی–ڈینسی کو تہس نہس کر کے اس پر قبضے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا، لیکن اس سے پہلے ہی میجر جنرل سر ہنری ہیولاک (Sir Henry Havelock) (۱۷۹۵–۲۴ نومبر ۱۸۵۷) اور لیفٹننٹ جنرل اوٹرم (Sir James Outram) (۱۸۰۳–۱۸۶۳) تازہ دم فوجیں لے کر آ گئے۔ انہوں نے ۲۳ ستمبر کی رات کو عالم باغ کی ہندوستانی چوکی پر حملہ کر کے وہاں موجود سپاہیوں کو تہ تیغ کر کے قبضہ کر لیا۔

۵-۲۵ ستمبر کی رات کو دونوں جنرلوں نے ناکہ ہنڈولہ کے قریب نہر غازی الدین حیدر کو پار کیا اور شہر کے مشرقی حصے میں داخل ہو گئے، اس کے بعد لڑتے بھڑتے، موتی محل، خورشید منزل۔ قیصر باغ، تارہ والی کوٹھی، لال بارہ دری اور پھر چھتر منزل ہوتے ہوئے ریزی–ڈینسی میں داخل

ہو گئے، ان کے پیچھے حریت پسندوں نے بھی ریزی-ڈینسی میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ دوسری جانب جنرل اوٹرم اور ہیولاک اپنے کچھ دستے عالم باغ میں چھوڑ آئے تھے، ان سے بھی حریت پسندوں کی جھڑپیں جاری تھیں۔ مولوی احمد اللہ شاہ کے دستوں نے ان پر حملہ کیا، لیکن انگریزی توپوں کی وجہ سے دست بدست جنگ کا موقع نہیں آیا۔

۶-۷ اکتوبر کو عالم باغ میں محصور انگریزی فوج کے ایک مورچے میں حریت پسندوں نے رخنہ ڈال دیا، لیکن عقبی حملے کی وجہ سے انہیں میدان چھوڑنا پڑا۔

۷-اس کے بعد انگریزوں کے لئے کانپور سے کمک آگئی۔ اس ہراول فوج کے پیچھے جنرل "ہوپ گرانٹ" (Sir James Hope Grant)(۱۸۰۸-۱۸۷۵) پنجابیوں، سکھوں، گورکھوں اور گوروں کے ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ آرہا تھا، وہ ۲۰ اکتوبر کو گنگا پار کر کے ۲۱ اکتوبر کو بنتھرا (لکھنؤ) پہونچ گیا اور اسی روز عالم باغ کے انگریزی لشکر سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

۸-اسی درمیان ہندوستان میں انگریزی فوج کا کمانڈر انچیف، فیلڈ مارشل "کالن کیمپ-بیل" (Colin Campbell)(۱۷۹۲-۱۸۶۳) بھی عالم باغ پہونچ چکا تھا۔ نیپال کا وزیر اعظم رانا جنگ بہادر بھی انگریزوں کی مدد کے لئے گورکھا فوجیں بھیج رہا تھا۔ ریزی-ڈینسی میں محصور انگریزوں نے چند غدار ہندوستانیوں کے ذریعہ اپنے سپہ سالار سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان غدار ہندوستانیوں میں "قنوجی لال' نامی ایک شخص پیش پیش تھا۔ جنرل اوٹرم نے آئر لینڈ کے ایک شخص "کواناگ" (Thomas Henry Kavanagh)-(۱۸۲۱-۱۸۸۲) اور قنوجی لال کے ذریعے کالن کیمپ-بیل کو ایک نقشہ بھیجا، تاکہ وہ اس کی مدد سے لکھنؤ پر حملہ کرے۔ ہندوستانی بھی غافل نہیں تھے، انہوں نے فتح علی خاں کے تالاب سے ناکہ ہنڈولہ تک فوجیں لگا دی تھیں، اور وہاں سے تال کٹورے کی کربلا تک ایسے مورچے قائم کر رکھے تھے، جو انگریزں کی تربیت یافتہ اور منظم فوج سے بھی نہیں توڑے جا سکتے تھے۔ (عیش باغ کا علاقہ ناکہ ہنڈولہ اور تال کٹورے کے درمیان ہے)۔ دوسری طرف دلکشا سے شاہ نجف تک جا بجا توپیں چڑھی ہوئیں تھیں، اور گومتی کے اس پار جنگ آزادی کے سپاہی دور دور تک مورچے بنائے ہوئے تھے۔

۹-۱۴ نومبر کو کالن کیمپ-بیل نے جنرل اوٹرم کے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق، عالم باغ سے پیش قدمی شروع کی اور فتح علی خاں کے تالاب کی چوکیوں پر بھاری توپوں سے حملہ کر کے ان کو مسمار کر دیا، دلکشا پر قبضہ کر کے لا مارٹینئر پر حملہ کر دیا، ان دونوں مقامات پر ہندوستانیوں نے زبردست مدافعت کی، لیکن ہتھیاروں کی برتری کے باعث انگریز آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۰-۱۶ نومبر کو سکندر باغ کی تاریخی اور خوفناک جنگ ہوئی، جس میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ سکندر باغ کی عمارت کے بالائی حصے پر شاہ ہند بہادر شاہ ظفر کا سبز پرچم لہرا رہا تھا، اور اس کے نیچے تاجدار اودھ کا پرچم اڑ رہا تھا۔ دو پہر گیارہ بجے سے لڑائی شروع ہوئی اور غروب آفتاب تک اس مورچے پر لڑنے والا ہر ہندوستانی ملک عزیز پر اپنی جان قربان کر چکا تھا۔ اس معرکے میں حریت پسندوں کی کمان سید برکت احمد کے ہاتھ تھی، انہوں نے اور ان کے جانبازوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے، لیکن آخر کار فتح انگریزوں کا مقدر بنی۔ ہندوستانیوں نے جس بے جگری کا مظاہرہ کیا، اس کا اعتراف کالن کیمپ-بیل نے بھی کیا۔

۱۱-۱۷ نومبر کو قدم رسول اور شاہ نجف میں لڑائی ہوئی، اور اس روز تین بجے کالن کیمپ-بیل نے موتی محل، خورشید منزل اور تارے والی کوٹھی پر قبضہ کر کے ریزی-ڈینسی تک رسائی حاصل کر لی، ہندوستانیوں نے بہت کوشش کی لیکن انگریزوں کو ریزی-ڈینسی سے نکل بھاگنے کا موقع مل گیا۔

۱۲-۱۷ نومبر کی رات کو مولوی احمد اللہ شاہ نے ریزی-ڈینسی پر ایک خوفناک حملہ کیا، اور ۱۸ نومبر کو پورا دن دونوں اطراف سے گولیاں چلتی رہیں، حملے کی شدت بڑھتی جا رہی تھی، اس لئے کالن کیمپ-بیل نے شہر پر قبضہ کر کے امن بحال کرنے کے بعد پھر رات کی تاریکی میں ریزی-ڈینسی کو خالی کر دیا اور سکندر باغ اور دلکشا ہوتا ہوا، اپنی افواج اور محصورین کے ساتھ لکھنؤ کی حدود سے باہر نکل گیا اور ہندوستانیوں نے ریزی-ڈینسی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مارچ ۱۸۵۸ تک انگریزوں نے اودھ (لکھنؤ) کا رخ نہیں کیا اور اودھ سے کمپنی کا تسلط ختم ہو گیا۔ دہلی، الہ آباد، کانپور اور یو پی کے دیگر علاقوں پر انگریزوں کا راج قائم ہو چکا تھا، اب صرف لکھنؤ اور اودھ کا کچھ علاقہ رہ گیا تھا۔

۱۳-۸ مارچ ۱۸۵۸ کو انگریزوں نے پھر لکھنؤ کی طرف رخ کیا۔ اس وقت جنرل بخت خاں (۱۷۹۷-۱۸۵۹) بھی لکھنؤ میں ہی تھے، انگریز کئی سمتوں سے لکھنؤ کی طرف بڑھے، جنرل بخت خاں نے چکر والی کوٹھی کے قریب مشرقی مورچہ سنبھالا اور مولوی احمد اللہ شاہ نے جنوبی اور مغربی مورچوں پر مقابلہ کیا۔ ان دونوں سالاروں کی فوجیں آٹھ روز تک لڑتی رہیں۔ لکھنو کا آخری بڑا معرکہ موسی باغ میں ہوا، جس میں مولوی احمد اللہ شاہ

نے جم کر مقابلہ کیا، لیکن میگزین کی کمی کی وجہ سے جنگ آزادی کے اس ہیرو کو وہاں ہٹنا پڑا اور ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء مطابق ۲۹ رجب ۱۲۷۴ھ کو انگریز پوری طرح لکھنؤ پر قابض ہو گئے۔[۶]

انقلاب 1857ء میں عیش باغ کا محاذ:

"۱۸۵۷ء میں اودھ کا محاذ معاصر اردو مآخذ کی روشنی میں" ڈاکٹر درخشاں تاجور کی قابل قدر تحقیقی تصنیف ہے۔ ۲۰۱۵ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، کے مالی تعاون سے کتاب کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ اس کتاب میں معتبر کتابوں کے حوالے سے متعدد مقامات پر "عیش باغ" کا تذکرہ ہے اور مستند ماخذ کے روشنی میں ۱۸۵۷ میں عیش باغ میں ہونے والی انقلابی سرگرمیوں کا بھی واضح طور پر تذکرہ کیا گیا ہے، جس سے عیش باغ کی تاریخ پر پڑے تاریکی کے پردوں کی پردہ دری ہوتی ہے۔

ص: ۶۲-۶۳ پر ہے:

"بیگمات اودھ کے خطوط" میں واجد علی شاہ کے نام ایک خط نواب فرخندہ محل کا بھی ہے۔ جس میں انہوں نے لکھنؤ میں ۱۸۵۷ء میں ہونے والے ہنگامے کی تفصیل واجد علی شاہ کو لکھ کر بھیجی ہے اور ان سے پوچھا ہے کہ انہیں لکھنؤ کے تازہ حالات کلکتے میں فراہم ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ اپنے خطوط میں انہیں لکھنؤ میں رونما ہوئے واقعات رقم کر کے بھیجیں۔ فرخندہ محل نے اگر چہ اپنے اس خط سے واجد علی شاہ کو لکھنؤ کے حالات سے روبرو کرانا چاہا ہے لیکن آج ان کا یہ خط لکھنؤ کے عیش باغ اور موسی باغ میں ہونے والی انقلابی سرگرمیوں کا پتہ دیتا ہے اور تاریخ کا ایک مستند ماخذ بن گیا ہے۔ خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"لکھنؤ میں تازہ روداد ہوئی، جس سے طبیعت کچھ شاد ہوئی۔ آٹھویں کو اس مہینے کی روز یک شنبہ دوپہر سے فوج فرنگی تقسیم پر کارتوسوں کے بگڑ گئی، جنگ و جدل کی ٹھہر گئی۔ سب فوج موسی باغ میں عیسائیوں کے قتل کو ایک جا ہوئی۔ اول بہتوں پر ہیبت غالب ہوئی کتنا مردمان فوج کو سمجھایا ان لوگوں کے خیال میں نہ آیا۔ آخر ان احمقوں نے کئی سو گورے نکالے اور قریب شام قتل کی سمت کو روانہ کیا۔ عیش باغ میں پندرہ سو آدمی جمع ہو چکے تھے۔ وقت تحریر اب تک وہیں مجمع کثیر ہے۔ علماء علم محمدی اٹھانے کو ہیں۔ دیکھئے کیا ہوتی اس کی اخیر ہے۔ بے ڈھب ہوا۔ یہ بگاڑ ہے اب تو عیسائیوں کو موسی باغ جانا پہاڑ ہے۔ اطلاعا لکھا ہے۔ آگاہ تم کو کیا ہے اور اے جان عالم معلوم نہیں یہاں کے اخبار ہر روز تم کو مطالعہ سے گذرتے ہیں یا اہلکار پوشیدہ کرتے ہیں۔ جیسا ہو ویسا لکھو۔ ہم یہاں سے تحریر کیا کریں۔"

لکھنؤ میں انقلاب ۱۸۵۷ء کی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز ۳۰ مئی ۱۸۵۷ء سے ہوا۔ مگر بغاوت کی آگ اس سے پہلے ہی اندر اندر سلگنے لگی تھی۔ مذکورہ خط میں کارتوسوں کی تقسیم پر جس جنگ و جدل کا ذکر ہے، اس میں آٹھویں تاریخ روز یک شنبہ یعنی اتوار کا ذکر ہے۔ سال کا ذکر یہاں نہیں ہے۔ دیگر ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہجری سال ۱۲۷۳ ماہ رمضان کا واقعہ ہے۔ ۸ رمضان ۱۲۷۳ھ کی مطابقت آن لائن کنورٹر میں ۳ مئی ۱۸۵۷ء سے ہوتی ہے۔

مگر جن مصادر میں مذکورہ واقعہ کی انگریزی تاریخ کا ذکر ہے، وہاں یکم مئی کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ سید خورشید مصطفے رضوی نے تاریخ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں لکھا ہے:

"سپاہ نے کارتوس لینے سے (یکم مئی ۵۷ء) انکار کیا اور ان کے لیڈروں نے بھی بغاوت کی اسکیم بنالی، جس میں صوبے دار سرنام سنگھ، جمع دار شیو دین، مغل بیگ، بھیروں سنگھ اور گلزار خاں وغیرہ شامل تھے۔ انہوں نے فوجوں کے نام خط روانہ کئے، ادھر یہ پر جوش سپاہی ایک انگریز افسر کے خیمے میں گھس گئے اور اس کو قتل کرنا چاہا مگر اس کے گڑگڑانے پر چھوڑ دیا۔ ۳۲ نمبر پلٹن کے نام ایک خط انگریزوں کے ہاتھ لگا، جو منڈیاؤں کی چھاؤنی سے بھیجا گیا تھا۔ اس خط سے سراغ پا کر خفیہ سازش کرنے والے گرفتار ہو گئے۔ ان سپاہیوں نے بغاوت کی سازش میں شرکت کا اقرار کیا اور علی الاعلان بغاوت پر آمادہ ہو کر بندوقیں سنبھال لیں۔ اگلے دن ۴ مئی کو موسی باغ میں ان سپاہیوں کو گھیر کر قتل اور پھانسیوں کا دور شروع ہو گیا جس سے عوام اور بھی مشتعل ہو گئے۔ شہر میں اشتہار نکلنا شروع ہو گئے۔ ایک فارسی اشتہار میں مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ پر ابھارا گیا تھا۔ ایک اور پوسٹر فوج کی چھاؤنی (کیولری لائن) میں پایا گیا۔ دیواروں پر بھی پوسٹر لگائے گئے، جن میں اس موقع پر خاموش رہنے والوں کو انگریز کا تخم اور پیدائشی سور کہا گیا اور لعنت بھیجی گئی تھی۔"[۷]

مذکورہ خط کے ساتھ اس اقتباس کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو باقاعدہ انقلاب سے پہلے "بغاوت" کی ابتدائی صورت حال کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے، اور یہ بھی کہ تاریخوں کے تعین میں ایک دو روز کا اختلاف، خاص کر ہجری اور انگریزی تقویم کی مطابقت کے پس منظر میں بعید از قیاس نہیں۔

یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ باقاعدہ ہمہ گیر انقلاب کے آغاز سے پہلے ، اوائل مئی ۱۸۵۷ مطابق رمضان ۱۲۷۳ھ میں لکھنؤ میں بغاوت کی جو چنگاری بھڑکی، اس کا ایک مرکز ''عیش باغ'' بھی تھا۔

انقلابی چہل پہل کی شروعات ہونے کے بعد کچھ انقلاب پسندوں نے دار السلطنت دہلی کا رخ کیا۔ جو لکھنؤ میں رہے انہوں نے مختلف مقامات پر جمع ہو کر انگریزی فوجوں سے مقابلہ آرائی کی ٹھانی۔ ڈاکٹر درخشاں تاجور نے کمال الدین حیدر کی ''قیصر التواریخ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان تمام سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے، اور قیصر التواریخ کے حوالے سے جو اقتباسات نقل کئے ہیں، ان میں سے درج اقتباس میں عیش باغ کا ذکر قابل توجہ ہے:

''اس عرصے میں مفسدین کوتاہ اندیش شہر نے طرفہ ہنگامہ برپا کیا اور مستعد شریک سپاہ باغی ہوئے چنانچہ محلہ منصور نگر، سعادت گنج، مشک گنج سے نشان محمدی اٹھا کر عیش باغ میں جمع ہونا شروع کیا۔۔۔

۔۔۔غرض عیش باغ میں جب تقریباً پندرہ سو آدمی جمع ہو چکے نشان محمدی اٹھا کر چوک کو چلے۔۔۔''[۸]

لکھنؤ کی سرزمین پر انقلاب ستاون کی معرکہ آرائیوں میں میر نجف علی داروغہ توپ خانہ اور مرزا امام علی بیگ صوبہ دار توپ خانہ کی جواں مردی ناقابل فراموش اہمیت کی حامل ہے۔ ۵ صفر ۱۲۷۴ھ بروز جمعہ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کو چار باغ، اور عیش باغ سے متصل ''ناکہ'' (ناکہ ہنڈولہ چوراہا) کے اطراف میں انگریزی فوجوں کے ساتھ تصادم میں دونوں بہادروں نے جام شہادت نوش کیا۔

کمال الدین حیدر کے قلم سے اس معرکہ آرائی کی داستان رقم کرنے کے بعد محترمہ درخشاں تاجور کہتی ہیں:

''وہاں سے گورے آگے بڑھے تو ان کا مقابلہ نبی بخش خاں زمیندار بھٹوا مئو سے ہوا وہاں بھی انقلابیوں نے انگریزوں سے جم کر مقابلہ کیا اس معرکے کو کمال الدین حیدر نے قیصر التواریخ میں قلم بند کیا۔ لکھتے ہیں:

''گورے۔۔۔ عیش باغ کی سڑک پر چلے غلام حسین کی مسجد پر نبی بخش خاں سگے بھائی ہادی حسن خاں زمیندار بھٹوا مئو اپنے جان نثار سرفروشوں سے وہاں تھے۔ مقابلہ ہوا، خوب تلوار چلی۔ طرفین سے خون ناحق خدا کے گھر میں بہا۔ آخر وہیں لڑ بھڑ کر سب مارے گئے ایک نام کر دیا تجمل حسین خاں ان کے بھائی زخمی ہو کر بچے۔ اس معرکے میں پانچ سو ادھر کے مارے گئے، سو ادھر کے، بس شہر میں طلاطم [کذا، صحیح: تلاطم] ہو گیا۔ بازار میں دوکانیں بند ہو گئیں۔ رعایا نے اپنے گھر کے دروازے بند کر لئے۔ پھر گورے گھبرا کر عیش باغ سے سڑک امین آباد پر آئے، تیلیوں کو مارا، تلنگوں نے دونوں طرف سے گولیاں ماریں مگر وہ چپکے ٹولی باندھے چلے جاتے تھے۔''[۹]

عیش باغ کا محاذ اور مولوی احمد اللہ شاہ:

مولوی احمد اللہ شاہ انقلاب اٹھارہ سو ستاون کا بڑا اہم نام ہے۔ ملک کے مختلف حصے ان کی انقلابی سرگرمیوں کا مرکز بنے۔ اودھ، خاص کر لکھنؤ اور عیش باغ کی سرزمین بھی اس اولو العزم رہنما کی شمشیر خارا شگاف کی عینی شاہد رہی ہے۔ مولوی احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ کے جن مختلف مقامات پر انگریزی فوج کے ساتھ محاذ آرائی کی، ان میں عیش باغ کا نام کافی اہمیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر درخشاں رقم طراز ہیں:

''---نامساعد حالات میں بھی اودھ کے محاذ پر نبرد آزما رہنما حوصلہ و ہمت کی نئی تاریخ رقم کر رہے تھے۔ کمال الدین حیدر نے یہ لکھا ہے کہ اس وقت جب جنگ کا نقشہ بالکل بگڑ چکا تھا، لوگوں کی ہمتیں جواب دے رہی تھیں، احمد اللہ شاہ اور فیروز شاہ بہادری کے ساتھ انگریزوں کو داد شجاعت دے رہے تھے، حالانکہ اس وقت بڑی تعداد میں اہل شہر دل برداشتہ ہو کر شہر سے باہر نکل رہے۔ ان تمام حقائق پر روشنی ڈالتے ہوئے کمال الدین حیدر لکھتا ہے:

''احمد اللہ شاہ نے تلنگے سوار جمع کر کے فیروز شاہ سے کہا تم پکے پل سے دھاوا کرو، میں عیش باغ سے کروں گا۔ وہاں بھی جنگ بہادر کی پلٹن سے خوب تلوار چلی۔ جب ان کی اور کمک آئی، شاہ جی بھاگ کر نخاس میں آئے، گورے، چوک، مچھلی والی بارہ دری، اکبری دروازے تک پھیل گئے، پھر شام سے رات بھر بم کے گولوں کا مینہ برستا رہا۔۔''[۱۰]

مولوی احمد اللہ شاہ کے آخری مورچوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کمال الدین حیدر نے لکھا ہے:

''۳۰ تاریخ رجب روز چہار شنبہ۔۔۔[۱۲۷۴ھ مطابق ۱۷ مارچ ۱۸۵۸ء]۔۔۔ فوج انگریزی نے پہلے چاہا کہ عالم باغ سے گڑھی کنوارا ہو [کر] ناکہ حیدر گنج سے داخل شہر ہو جاوے، پلٹن جنگ بہادر عیش باغ سے چلی۔ احمد اللہ شاہ سرائے معتمد الدولہ سے فوج لے کر عیش باغ میں جا پہونچا۔

خوب تلوار چلی۔ کئی سو بھوٹیہ مارا گیا۔ آخر باغ سے انہیں ہٹا دیا۔ وہ سب سمٹ کر کنار شہر آئے، ادھر سے فوج انگریزی آتی تھی، وہاں بھی شاہ جی دل کھول کر لڑے۔ فوج انگریزی کو نہر سے اس پار اترنے نہ دیا۔ شاہ جی کی طرف سے تین چار توپ بھی چلی۔ جب فوج انگریزی نے دھاوا کیا، پہلے حملہ یورش میں سوار بھاگے۔۔۔اس معرکے سے پندرہ سو سوار شہر کی طرف بھاگے تھے، حیدر گنج نو بستہ ہو کر سعادت گنج پہونچے، بعد اس کے شاہ جی پھر کر درگاہ حضرت عباس میں آئے، ایک مورچہ قائم کیا، دوسرا سعادت گنج کی لال کوٹھی پر اور توپ بڑھ کر تیراہے پر لگائی۔۔۔ عیش باغ سے حیدر گنج، نو بستہ سعادت گنج تک مینہ گولیوں کا رعایا پر برستا رہا، ہر گھر رشک چاند ماری ہو گیا اگر چہ بہت رعایا اپنے گھر میں رہ گئی تھی۔ غرہ شعبان پنجشنبہ کو گورے چوک، فرنگی محل، نخاس، کاظمین، منصور نگر تک پھیل گئے اور مورچہ کاظمین کربلا سے دیانت الدولہ دلی دروازے میں قائم کیا۔۔۔"[۱۱]

اس معرکے کے بعد مولوی احمد اللہ شاہ لڑتے بھڑتے، بچتے بچاتے اور جواں مردی کی نئی تاریخ رقم کرتے ہوئے، لکھنؤ سے نکل گئے۔

۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوجیں لکھنؤ پر غالب آگئیں اور انقلابیوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ بیگم حضرت محل نے بھی اسی تاریخ میں قیصر باغ کو خیر باد کہا۔ مولانا احمد اللہ شاہ کو بھی اگرچہ پسپا ہونا پڑا، مگر دوسرے ہی روز انہوں نے پھر سے اپنی فوج منظم کی اور عیش باغ، سرائے آغا میر اور درگاہ حضرت عباس (چوپٹیاں) کے احاطے میں جنگی کاروائیاں کیں۔

سید خورشید مصطفے رضوی نے ایک انگریز مؤرخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"باغیوں کا سب سے ضدی اور ہٹیلا سردار مولوی [یعنی احمد اللہ شاہ] پھر لکھنؤ لوٹ آیا اور شہر کے بیچ یعنی شہادت گنج [سعادت گنج؟] کی ایک مضبوط قلعہ بند عمارت میں موجود تھا۔۔۔ اسے نکالنے کے لئے ۲۱ مارچ کو لگارڈ کو بھیجا گیا۔۔۔ باغیوں نے کبھی اس قدر ثابت قدمی اور استقلال کا مظاہرہ نہ کیا تھا جیسا کہ یہاں دیکھنے میں آیا، انہوں نے بے مثال بہادری سے اپنا دفاع کیا اور اس وقت تک نہ نکالے جا سکے جب تک انہوں نے ہمارے بہت سے آدمیوں کو قتل اور زخمی نہ کر دیا۔"[۱۲]

چند سطروں بعد خورشید مصطفے "احسن التواریخ" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"مولانا نے ۱۸ مارچ کو دوبارہ فوج منظم کر لی، پہلے عیش باغ پر جنگ کی پھر سرائے آغا میر پر اور اس کے بعد درگاہ حضرت عباس کے احاطے میں۔۔۔"[۱۳]

آگے پھر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"مولانا احمد اللہ کے ایک ساتھی پیر ظہور علی نے اپنے بیان میں بتایا کہ وہ [یعنی مولانا احمد اللہ شاہ] لکھنؤ کی شکست کے وقت عیش باغ میں مع دو ہزار ساتھیوں کے تھے۔ یہاں سے موسی باغ گئے اور تمام دن جنگ ہوئی۔ شام کو وہ شہر (خانقاہ) میں گئے۔ جنگ اگلے دن بھی ہوئی اور اسی دن وہ باڑی روانہ ہوئے۔"[۱۴]

اس کے بعد مولانا احمد اللہ غالباً خیر آباد ہوتے ہوئے باڑی (ضلع سیتاپور) پہونچے۔ ۲۶ مارچ کو وہ باڑی پہونچ چکے تھے۔[۱۵]

شکست لکھنؤ کے وقت "عیش باغ" میں فوج کے ساتھ مولانا احمد اللہ شاہ کی موجودگی کا واقعہ، ڈاکٹر درخشاں تاجور نے بھی "مرقع خسروی" کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مرقع خسروی سے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے، جس میں مولانا احمد اللہ شاہ کی آخری جنگی کاروائیوں کا ذکر ہے۔ اسی طویل اقتباس میں ہے:

"بایں ہمہ خرابی لکھنؤ میں باوصف نہ ہونے رئیسہ اور نکل جانے تمام خلقت کے احمد اللہ شاہ مستعد باللہ کراماتی معہ اپنے ساتھی عیش باغ میں رستمانہ ٹھہرے رہے، کروڑوں کے دانت کھٹے کر دیئے، چنانچہ منگل اور بدھ دو دن [یعنی ۱۶ اور ۱۷ مارچ] وہ یہاں گھمسان کرتے رہے۔۔۔" [۱۶]

اس کے بعد اس اقتباس میں بھی جمعرات اور جمعہ کو موسی باغ اور درگاہ حضرت عباس میں مولانا احمد اللہ شاہ کی معرکہ آرائی اور داد شجاعت دیتے ہوئے، خیر آباد ہو کر باڑی پہونچنے کا ذکر ہے۔

انقلاب ستاون میں عیش باغ سے متعلق ایک اہم فارسی دستاویز:

سید خورشید مصطفے رضوی نے اپنی انتہائی وقیع اور تحقیقی تصنیف "تاریخ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" میں، ضمیمہ جات کے بیان میں، متعدد اہم تاریخی دستاویزات محفوظ کی ہیں۔ ان میں متعدد خطوط ہیں جو مختلف لوگوں نے مولانا احمد اللہ شاہ کے نام لکھے ہیں۔ ایک خط میں عیش باغ میں مورچہ بندی کا ذکر ہے۔ اس خط میں ۱۳ اپریل ۱۸۵۸ء کی تاریخ مذکور ہے، جس سے واضح ہے کہ لکھنؤ پر انگریزوں کی بالادستی قائم ہونے کے بعد بھی عیش باغ

میں انقلابی سرگرمیوں کے تانے بانے بنے جاتے رہے اور عیش باغ حریت پسندوں کا مرکز بنا رہا۔ خط کا متن حسب ذیل ہے:

عرضی قادر بخش داروغہ میگزین بنام احمد اللہ شاہ

مورخہ ۱۸ شعبان ۱۲۷۴ھ (۳ اپریل ۱۸۵۸ء)

از انجا کہ ایں خادم بسبب ہنگامہ و یورش کفاراں، از شہر لکھنوٗ جلاوطن شدہ، متعلقاں را بجائے حفاظت رسایند [کذا، رسانید ؟] و در سرائے آغامیر رقدر [کذا، آغامیر قدر ؟] کہ میگزین بہ امکان فدوی حاصل بود، بہ حضوری والا رسایند [رسانید ؟] و بجا آوری حکم والا بجا آوردم، و ہزاراں روپیہ رامال حساب در شہر لکھنوٗ گذاشتہ رفت طوریکہ نوبت چیست چہ عرض سازم جایکہ قیام گریز ہستم جملہ قوم مسلمین۔۔۔السلام رئیس اند عنقریب جملہ صاحبان بنابر جنگ کفاراں حاضر حضور می شوند۔ لہٰذا امیدوار فضل و کرم کہ جواب عرضی و یک قطعہ حکمنامہ بنام ناظم خیر آباد، در باب میگزین عنایت کردہ کہ ہر قدر کہ میگزین در علاقہ خیر آباد ممکن شود، صد باب آں نمودہ تلاش کردہ، قریب حاضر حضور سازم، و بنظر عنایات دستگیری کہ من خادم قدیم وابستہ دامن دولت حضور است، از روداد کیفیت شہر لکھنوٗ و مجتمع شدن افواج جنگی و تعلقداران ایں فدوی را اطلاع بخشند دریں ولا باستماع رسید کہ تعلقداران علاقہ بیسواڑہ و سلطانپور در شہر لکھنوٗ رسیدہ، قتل کفاراں نمودند و مورچہ در عیش باغ قرار گرفتند، بسمع خوش خبری بایں طور جملہ زمینداراں و تعلقداراں تیاری حاضری حضور دارند، زودی جملہ عرائضات کہ بخدمت فیض درجب عرض کردہ اند، مرحمت بشود کہ خود را جلد بہ نیاز قدم قدم بوسی پایہ آستانہ عالی رسانم واجب بود، عرض نمود۔

کمترین خادم قادر بخش داروغہ میگزین

مہر

محاذ عیش باغ کا اجمالی خاکہ:

درج بالا تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ انقلاب اٹھارہ سو ستاون کے درمیان ”عیش باغ“ آغاز سے اختتام تک بغاوتوں، شورشوں اور خوں ریز معرکہ آرائیوں کا مرکز اور اہم محاذ بنا رہا۔ مذکورہ سطور میں عیش باغ میں ہونے والی جن معرکہ آرائیوں کا صراحتاً یا ضمناً تذکرہ ہوا ہے، ان کا اجمالی خاکہ حسب ذیل ہے:

انقلاب ستاون کے باقاعدہ آغاز سے پہلے لکھنوٗ کے موسی باغ اور عیش باغ میں فوج کی طرف سے ”باغیانہ“ سرگرمیاں اوائل مئی ۱۸۵۷ء میں روپذیر ہوئیں۔ بعد میں فوج کے ساتھ عوام بھی ان میں شامل ہو گئے۔ جیسا کہ نواب فرخندہ محل کے خط اور خورشید مصطفےٰ رضوی کی تاریخ جنگ آزادی کے حوالے سے مذکور ہوا۔ یعنی عیش باغ کی سرزمین انقلاب کی چنگاری سلگانے اور دہکانے میں پیش پیش تھی۔

لکھنوٗ ریزیڈنسی کے محاصرے دوران ”چار باغ“ اور ”ناکہ“ کے اطراف (یعنی عیش باغ، کیوں کہ عیش باغ ناکہ سے ملا ہوا ہے) میں میر نجف علی داروغہ توپ خانہ اور مرزا امام علی بیگ صوبے دار توپ خانہ نے انگریزی فوجوں سے معرکہ آرائی کی اور شہید ہوئے، اس کے بعد عیش باغ روڈ پر بھی جنگ ہوئی۔

- عیش باغ میں مولوی احمد اللہ شاہ کی معرکہ آرائی، جس میں انہوں نے شہزادہ فیروز شاہ کو ”پکے پل“ سے دھاوا کرنے کو کہا اور خود ”عیش باغ“ کا محاذ سنبھالا۔

لکھنوٗ پر ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ کو انگریزی تسلط قائم ہونے کے دوسرے دن (۱۷ مارچ ۱۸۵۸) انگریزوں اور مولوی احمد اللہ شاہ کے درمیان عیش باغ،

- سرائے آغا میر اور درگاہ حضرت عباس کے احاطے میں خوں ریز تصادم۔

قیام تسلط کے تیسرے روز یعنی ۱۸ مارچ ۱۸۵۸ کو پھر سے انگریزی فوج اور مولوی احمد اللہ شاہ کے مابین عیش باغ میں معرکہ آرائی۔

۳ اپریل ۱۸۵۸ کے مذکورہ بالا خط میں عیش باغ میں مورچہ بندی کا تذکرہ، اس بات پر دال ہے کہ مولوی احمد اللہ شاہ کے لکھنوٗ سے رخصت ہو

- نے کے بعد بھی، ان کے جاں نثار سپاہی سرگرم عمل رہے اور ایک عرصے تک انگریزوں سے پنجہ آزمائی کرتے رہے، اور ان سرگرمیوں کا ایک مرکز عیش باغ بھی تھا۔

- انقلاب ۱۸۵۷ کی طویل جد و جہد میں یہ وہ مقامات ہیں، جہاں عیش باغ کا تذکرہ صراحتاً دستیاب ہے، لیکن لکھنوٗ کے جغرافیے سے واقف حضرات کو اس بات کا اندازہ ہو گا کہ جنوبی سمت سے ریزی–ڈینسی یا قیصر باغ تک پہونچنے کے لئے جو راستے موجود ہیں، ان میں عیش باغ
- درمیان میں پڑتا ہے۔ آج عیش باغ کا رقبہ مختصر ہے، لیکن جیسا کہ گزرا، تاریخی طور پر عیش باغ کا رقبہ کافی وسیع تھا، اس بات کو پیش نظر رکھتے
- ہوئے یہ کہنا بجا ہو گا کہ اس وقت جنوبی سمت سے ریزی–ڈینسی یا قیصر باغ تک پہونچنے کے لئے عیش باغ کو چھوڑ کر آگے بڑھ پانا مشکل تھا، اس

لئے گمان غالب ہے کہ عیش باغ کی سرزمین قدم قدم پر معرکہ آرئیوں کی آماجگاہ رہی ہوگی، جس کی چند جھلکیاں مذکورہ بالا بیانات سے مترشح ہوتی ہیں۔

حوالہ جات:

-شباب لکھنؤ، محمد احد علی، الناظر پریس، لکھنؤ، ۱۹۱۲، ص: ۲۶۔
۲-انشائے بہار بے خزاں، ص: ۴۰۔
۳-تاریخ لکھنؤ باتصویر، سید آغا مہدی لکھنوی، کراچی، ۱۹۷۶، ص: ۲۶۴۔
۴-ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، پہلا اڈیشن: ۲۰۰۳، ص: ۸۲۔
۵-ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، گوپی چند نارنگ، ص: ۱۵۱ - ۱۵۲۔
۶-ملخصا از: ”لکھنؤ کے معرکے“، بقلم: خان محبوب طرزی، ”مشمولہ ”لکھنؤ اور جنگ آزادی“، شائع کردہ

انہیں شمس الضحی کہیے، انہیں بدر الدجی کہیے
سراپا دل نشیں ایسا کہ محبوب خدا کہیے

تمنائے سخا، آن وفا، کان حیا کہیے
نگار بزم ہستی، سرور ہر دوسرا کہیے

جہان حسن ہیں، حسن جہاں ہیں، جان عالم ہیں
ادائے حور جنت، روح بوئے گل کدہ کہیے

سبھی نبیوں، رسولوں سے ہیں افضل، ارفع و اعلی
امام المرسلیں کہیے، کہ ختم الانبیا کہیے

نہیں بھیجا ہے ،الا رحمۃ للعالمیں ان کو
خدا نے فرش گیتی پر، انہیں خیر الوری کہیے

الم نشرح کی آیت سے عیاں ہیں رفعتیں ان کی
تو سعدی کی زباں میں کیوں نا پھر بلغ العلی کہیے

ملے موقع کسی کو کہ نکالے وہ بخار دل
کبھی ایسا نہ کوئی لفظ مثل راعنا کہیے

کہیں قد جاء کم برہاں، کہیں قد جاء کم نور
کہیں یٰس، کہیں طٰہٰ، کہیں پر والضحی کہیے

عسی ان یبعثك قرآن میں فرمان باری ہے
تو محشر میں انہیں مالک لواء حمد کا کہیے

فرشتے بھیجتے ہیں، خود خدائے پاک بھی بھیجے
درود پاک کے گجرے، نبی کی شان کیا کہیے

ہے ناطق بعضہم درجات، رتبہ سب سے اونچا ہے
محمد مصطفے کی شان کو سب سے ورا کہیے

کرے گا کیا کوئی اندازہ، ان کی برتر عظمت کا
مجسم نور ہیں وہ، ان کو بس نور خدا کہیے

خدا کا فضل ہے، سرکار کی نظر عنایت ہے
کہ نوری کی زباں کو واصف نور الہدی کہیے

مقالہ نگار حضرات کے لیے ضروری ہدایات

۱-مقالہ اردو زبان میں ہو۔

۲- اقتباسات اردو کے علاوہ کسی اور زبان سے ماخوذ ہوں، تو ان کی عبارات اصل زبان (عربی، انگریزی وغیرہ) میں درج کی جائیں اور ساتھ میں ان کا اردو ترجمہ بھی۔

۳-مختصر اقتباسات ہو بہو اصل مع ترجمہ شامل مقالہ کئے جائیں، اور اقتباسات ایک صفحہ یا اس سے زیادہ سطور پر مشتمل ہوں تو ان کا خلاصہ اپنے لفظوں میں درج کر کے حوالہ دیا جائے۔

۴-مقالہ کسی علمی و تحقیقی موضوع پر ہو، اور ندرت و جدت کا حامل۔ موضوع دینی، ادبی، فکری، تعارفی، تنقیدی وغیرہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

۵-مقالہ اپنے موضوع پر جامع و مدلل اور معقول ہو۔ محض لفاظی یا نری جذباتیت سے گریز کیا جائے۔

۶-منظومات میں صرف حمد، نعت رسول ﷺ اور فکری و موضوعاتی نظمیں قابل قبول ہوں گی۔

۷-مقالہ/ منظوم کلام غیر مطبوعہ ہو۔ مطبوعہ مقالات و منظومات کی اشاعت نو کا معاملہ مجلس ادارت کی صواب دید پر ہوگا۔

۸-مقالہ/ منظوم کلام شوشیل میڈیا- جیسے فیس بک اور واٹس ایپ، وغیرہ پر نشر نہ کیا گیا ہو، ورنہ قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹-کہیں اور اشاعت کے لیے بھیجے گئے مقالات و منظومات ناقابل قبول ہوں گے۔

۱۰-مقالہ ایم ایس ورڈ یا انپیج تھری میں کمپوز شدہ ہو۔

۱۱-مقالہ اے فور (A۴) سائز میں کم سے کم ۱۰ (انپیج) اور زیادہ سے زیادہ ۳۰ صفحات (انپیج) یا ۵,۰۰۰-۷,۰۰۰ الفاظ (ورڈ) پر مشتمل ہو۔

۱۲-مقالے کے لئے مطلوبہ فونٹ اور سائز وغیرہ کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

انپیج میں:

- اردو فونٹ: نوری نستعلیق، فونٹ سائز:۱۶
- عربی (حوالے کی عبارات) فونٹ: MuhammadiQuranic۱؛ فونٹ سائز:۱۵؛ لائن گیپنگ ۲۱۔
- انگریزی (حوالے کی عبارات): فونٹ TimesRoman: فونٹ سائز:۱۲۔

ورڈ میں:

- اردو فونٹ: جمیل نوری نستعلیق؛ فونٹ سائز:۱۵
- عربی (حوالے میں) فونٹ: TradArabic؛ فونٹ سائز:۱۵، لائن گیپنگ:۱ء۰؛ پیج مارجن:۳ء۵cm۔
- انگریزی (حوالے کی عبارات): فونٹ:TimesRoman؛ فونٹ سائز:۱۲۔

۱۳-مقالے فائنل کمپوز شدہ ہوں اور اغلاط کتابت و نقائص تحریر سے پاک، یعنی پروف شدہ ہوں۔

۱۴-حواشی مختصر ہوں اور مقالے کے آخر میں اینڈ نوٹ میں نمبر وار درج ہوں۔

۱۵-طویل حواشی ہوں تو کوشش کریں کہ انہیں متن کا حصہ بنا دیا جائے۔

۱۶-حوالے بھی مقالے کے آخر میں اینڈ نوٹس میں درج کریں، مثلا: کتاب کا نام، مصنف کا نام اور صفحہ نمبر۔

۱۷-اینڈ نوٹ کے نمبر سلسلہ وار ہوں۔

۱۸-حوالوں اور حواشی کا مطلوبہ فونٹ سائز ۱۲ ہے۔

۱۹-مقالے کے آخر میں تمام حوالے الف بائی ترتیب کے لحاظ سے کتابیات/ ببلیو گرافی/ مصادر و مراجع کے عنوان سے درج کریں اور کتاب و مصنف (مؤلف/ مترجم/ مرتب) کے نام کے ساتھ اشاعت، سال اشاعت مقام اشاعت یا مطبع کا تذکرہ نہ بھولیں۔ یہ تفصیلات دستیاب نہ ہوں، تو اس کی بھی وضاحت کر دیں۔

۲۰-حوالے کا انداز:

- قرآن مجید کے لیے: [سورہ نام؛ سورہ نمبر: آیت نمبر]- مثال: [سورہ فاتحہ،۱:۵]
- احادیث کی تخریج کے لیے: بخاری؛ صحیح البخاری، کتاب الایمان؛ ح:۳۰، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، اشاعت: اول/ دوم وغیرہ، سن اشاعت، جلد، ص:۔ جلد اور صفحے کو مختصراً اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے: ۲/ ۵۔
- دیگر کتب کے لیے (مثلا): دہلوی، شیخ عبد الحق (محدث)، اخبار الاخیار، اردو ترجمہ، مترجمین: مولانا سبحان محمود و مولانا محمد فاضل، ناشر: اکبر بک سیلرز، لاہور، سن اشاعت: ۲۰۰۴ء، ص:۲/ ۳۷ صفحات۔
- مقالات کے لیے: مقالہ نگار کا نام، مقالے کا نام، ماہ نامہ/ سہ ماہی/ جریدہ/ مجلہ کا نام؛ جلد نمبر، شمارہ نمبر، مہینہ و سن اشاعت، جگہ؛ صفحہ نمبر/ صفحات۔

۲۱-مقالے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔
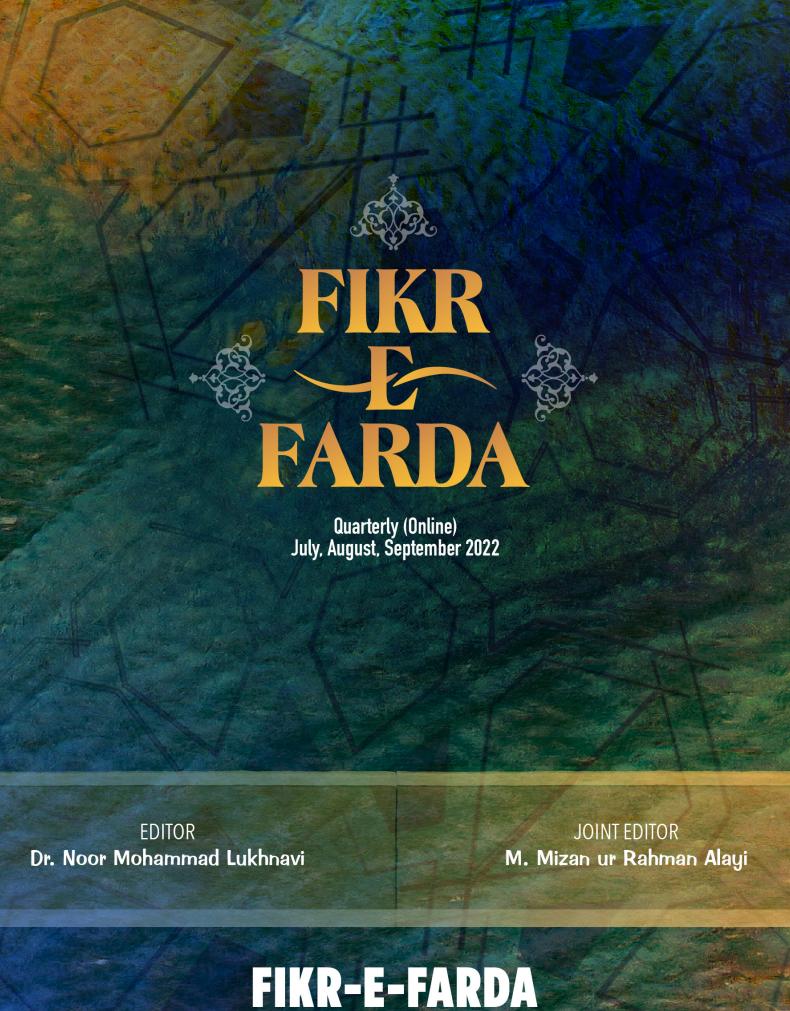
FIKR
E
FARDA
Quarterly (Online)
July, August, September 2022
EDITOR
Dr. Noor Mohammad Lukhnavi
JOINT EDITOR
M. Mizan ur Rahman Alayi
FIKR-E-FARDA
FOUNDATION
HYDERABAD DECCAN, TELANGANA, INDIA